اکادمی ادبیات پاکستان

پاکستانی ادب کے معمار

امر جلیل: شخصیت اور فن

پروفیسر کے۔ ایس۔ ناگپال

پاکستانی ادب کے معمار

امرجلیل
شخصیت اور فن

پروفیسر کے۔ ایس۔ ناگپال

اکادمی ادبیات پاکستان

کتاب کے جملہ حقوق بحق اکادمی محفوظ ہیں۔

نگرانِ اعلیٰ	:	فخر زمان
تدوین وطباعت	:	سعیدہ درانی
اسکیچ	:	احمد حبیب
اشاعت	:	2010
تعداد	:	500
ناشر	:	اکادمی ادبیات پاکستان، H-8/1، اسلام آباد
مطبع	:	گل اعوان پرنٹنگ پریس، اسلام آباد
قیمت	:	مجلد: -/220 روپے
		پیپر بیک: -/200 روپے

ISBN: 978-969-472-173-6

Pakistani Adab Key Memar

Amar jaleel : Shakhsiyat-aur-Fun

Compiled By

Professor K .S .Nag Pal

Publisher

Pakistan Academy of Letters

Islamabad,Pakistan

فہرست

پیش نامہ	فخر زمان	7
پیش لفظ	پروفیسر کے ایس ناگپال	9
حالاتِ زندگی۔تاریخ پیدائش، تعلیم، ضروری زندگی نامہ		11
امرجلیل کی شخصیت اور فن		27
پروفائیل۔امرجلیل کے متعلق		35
مطبوعہ کتب اور فکر فن پر مبنی۔کام کی تفصیل		37
امرجلیل بحیثیت ایک افسانہ نویس		47
امرجلیل بحیثیت ایک کالم نگار		61
امرجلیل بحیثیت ایک ڈرامہ نگار		69
امرجلیل بحیثیت ایک ناول نویس		75
امرجلیل نے کچھ فلموں کے لئے مکالمے بھی لکھے ہیں		81
امرجلیل کی شاعری		83
امرجلیل کے منتخب اشعار کا ترجمہ		85
گھر والوں کے تاثرات۔امرجلیل اپنوں کی نظر میں		95
ہم عصر ادیبوں کے امرجلیل کے فن اور شخصیت پر تاثرات اور ناقدین کی آرا		101
امرجلیل کے چند یادگار انٹرویوز		127

آتم کتھا(Autobiography) سے اقتباس 145
Amar Jaleel-To Kill Hemingway 157
امر جلیل۔سب جھوٹ جو سوچتے نہیں،خوش رہتے ہیں(کالم) 163
امر جلیل۔پانچواں موسم (اردو کہانی) 167
امر جلیل۔مان برف ۾ توسان ملندس(سندھی کہانی) 173
حوالا جات،کتابیات 211

پیش نامہ

پاکستانی زبانوں میں ہمارے مشاہیر نے پاکستانی ادب کے حوالے سے جو کام کیا ہے کسی بھی بین الاقوامی ادب کے مقابلے میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ اکادمی ادبیات پاکستان نے ان مشاہیر کے علمی وادبی کام اور اُن کی حیات کے بارے میں معلومات کو کتابی صورت میں لانے کے لیے پاکستانی ادب کے معمار کے نام سے اشاعتی منصوبہ شروع کیا ہے جس کے تحت پاکستانی زبانوں کے مشاہیر پر کتابیں شائع کی جارہی ہیں۔

عہد ساز ادیب امر جلیل اپنے اسلوب، طرز احساس اور زبان و بیان کے اعتبار سے انفرادی اسلوب کے حامل ہیں۔ انہوں نے سندھی ادب کے حوالے سے عہدِ حاضر میں اپنی الگ پہچان بنائی ہے۔ انہیں سندھی، اردو اور انگریزی زبان پر یکساں عبور حاصل ہے انہوں نے اپنی تحریروں میں معاشرے کی بنیادی قدروں کی ترجمانی کی ہے۔

وہ سندھ کے نامور افسانہ نگار، کالم نگار، ڈرامہ نگار ہیں ان کا شمار ان چند ادیبوں میں ہوتا ہے جو جدید ادب کی نمائندگی کرتے ہیں۔

اسی اشاعتی منصوبے کی ایک کتاب امر جلیل :شخصیت اور فن'' اکادمی ادبیات پاکستان کی درخواست پر ملک کے معروف محقق پروفیسر کے۔ ایس۔ ناگپال صاحب نے تالیف کی ہے۔ اس کتاب سے یقیناً اہل ادب اور عام قاری امر جلیل کی فن و شخصیت سے بہتر طور پر آگاہ ہوسکیں گے۔

یہ کتاب امر جلیل کے بارے میں ایک اہم دستاویز کی حیثیت کی حامل ہوگی۔ امید ہے کہ

اکادمی ادبیات پاکستان کے اشاعتی منصوبے ''پاکستانی ادب کے معمار'' کی کتاب ''امر جلیل: شخصیت اور فن'' کو ملک اور بیرون ملک یقیناً پسند کیا جائے گا۔

فخر زمان

پیش لفظ

خدا نے جس دن انسان کو پیدا کیا اور شیطان سے سجدہ کرنے کو کہا، اس دن افسانہ پیدا ہو گیا۔
اور شیطان نے جب انکار کیا تو اسی کے ساتھ ساتھ کشمکش کا عمل اور تصور بھی وجود میں آ گیا۔
یہ انسان کا پہلا تجربہ تھا جو اماں حوا نے بیان کیا اور اولاد آدم کا بیان افسانہ ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی

A piece of fiction of limited scope but self contained of unified in its focus on a single salient theme and effect.

Hemingway

STORY

This is a form of prose and like the Novel and Novelette, which are longer fictioned forms, Its composed of certain mutually interdependent elements. The major one theme or the idea on which story rests.

Britannica Encyclopedia

امر جلیل صاحب بنیادی طور پر ایک افسانہ نویس یا کہانی کار ہیں۔ اس کے ساتھ ایک ڈرامہ نگار، مکالمہ نویس، کالم نویس، ناولسٹ اور ایک اعلیٰ پایہ کے دانشور بھی ہیں۔ کسی بھی کتاب کو سمجھنے کے لئے ہمیں اس تاریخی دور، جس میں ادیب زندہ رہا ہے، کو سمجھنا، ان اقدار کو جاننا، اور خود

ادیب کو دیکھنا ضروری ہوتا ہے۔یعنی کتاب، عہدِ حاضر اور ادیب Book writer and age تینوں کا جاننا ضروری ہے۔اس کتاب میں کوشش کی گئی ہے کہ پہلے آج کی اقدار کو سمجھیں پھر شخصیت اور ان کی کہانیاں، کالم، انٹرویو اور ہم عصر لوگوں کے تاثرات سنتے ہیں۔تو آیئے ملتے ہیں امر جلیل صاحب سے۔

جب مسلمانوں کے لئے ایک الگ وطن لیا گیا تو رتن تلاؤ پرائمری اسکول کراچی کوئی واحد اسکول نہیں تھا جسے شعلوں کے نذر کیا گیا! انگنت تعلیمی ادارے جن میں کالجز اور یونیورسٹیاں بھی شامل ہیں ان کو برباد کیا گیا۔اس ایک گیارہ سالہ لڑکے کی طرح جو اپنے اس اسکول کے آگے حواس باختہ کھڑا اپنے مادرِ علمی کو آگ میں جلتا دیکھ رہا تھا، شعلے جس کے در و دیوار کو خاکستر کر رہے تھے، کئی ایسے اور بچے اپنی درسگاہوں کو جلتے برباد ہوتے دیکھ کر کیونکر ایک عام سی صحت مند زندگی جی سکتے ہیں! وہ اس وقت سے نفسیاتی اور جذباتی بیماریوں کا شکار ہو گئے ہیں۔

وہ گیارہ سالہ بچہ جو پچھلے چار سالوں سے صبح اسمبلی میں تمام بچوں سے مل کر ترانہ گاتا رہا، جس کی بازگشت اب سکول کے جلتے فرنیچر کی چٹکھتی آوازیں سنا رہی تھیں ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' اب وہ پھر اپنے منہ گنگناتا اسکول کی جلتی عمارت کی طرف بڑھنے لگا۔دیکھنے والوں نے اسے روک دیا۔اور وہ بیچارگی کے عالم میں اشکبار آنکھیں لئے بے بسی اور مایوسی سے شعلوں کی عمارت کو لپیٹتے ہوئے دیکھتا رہا! اپنے دونوں بھینچ کر آسماں کی طرف بازو اٹھا کر وہ چلایا ''کیوں، کیوں، کیوں؟'' اور وہ کیوں آج تک اس کا پیچھا نہیں چھوڑ رہی، اس کے کانوں اور دماغ میں اب تک گونج رہی ہے اور وہ گیارہ سالہ بچہ ہے امر جلیل جو آج تک اس کیوں کا جواب تلاش کرتا ہوا 73 سال کا ہو گیا ہے۔اور اب تک نارمل زندگی گذارنے سے قاصد ہے۔

میں کتاب میں معاونیت کے لئے مختیار ملاح اور دلشاد مرزا کا ممنون اور سہنی کے امر جلیل نمبر کا مشکور ہوں۔

پروفیسر کے ایس ناگپال

حالاتِ زندگی

تاریخ پیدائش، تعلیم ، ضروری زندگی نامہ

دادا محترم

امر جلیل کو ابتداء سے ہی ایک ادبی علمی اور مہذب خاندانی پس منظر ملا ۔آپ کے دادا قاضی فیض محمد گورنمنٹ اسکولز کے رجسٹرار تھے اور ایک سرکاری افسر کی حیثیت سے اپنے فرائض منصبی نہایت خوش اسلوبی سے سرانجام دیتے رہے۔گھر میں بھی وہی مہذب شستہ اور تعلیمی ماحول رہا کیونکہ علم وادب سے انہیں گہرا لگاؤ تھا۔ان کی شخصیت سے متاثر ہوکر تعلیم ہی سب کا اوڑھنا بچھونا ہوگئی ان کے پوتے پڑپوتے بھی شعبۂ تعلیم سے منسلک رہتے آئے اور اس طرح امر جلیل کے والد صاحب بھی بنیادی طور پر ایک استاد ہی تھے۔

امر جلیل کے والد محترم

نہایت روشن خیال جناب قاضی عبد الغنی صاحب جن کی شخصیت سے مرعوب ہو کر لوگ انہیں خان صاحب کہتے تھے۔آپ نے بمبئی یونیورسٹی سے 1920ء میں آنرز کیا اور تعلیم وتدریس میں جڑ گئے۔کراچی آکر درس وتدریس کا آغاز کیا۔آگے چل کر آپ کو تمام تعلیمی اداروں کا سربراہ بنا دیا گیا کیونکہ اس وقت یہی ایک عہدہ ہوتا تھا آپ نے انسپکٹر آف ایجوکیشنل انسٹی ٹیوشن سندھ کے فرائض منصبی سنبھالے۔آپ نے نہایت محنت، جفاکشی اور تندہی کے ساتھ تمام تعلیمی اداروں کی نگہداشت کی اور ایک فرض شناس اور ایماندار

تعلیمی افسر ہونے کی شہرت پائی: اسی سبب سے آگے چل کر آپ کو سندھ پبلک سروس کمیشن کا سیکرٹری مقرر کیا گیا جہاں سے آپ شاندار خدمات انجام دیتے ہوئے باعزت سبکدوش ہوئے۔

امر جلیل کی والدہ ماجدہ

آپ کی والدہ ماجدہ کا نام غلام فاطمہ تھا۔ نہایت ہی نیک اور پاکباز خاتون تھیں۔ تعلیم گھر پر ہی حاصل کی اور طبیعت پوری طرح صوفی ازم کی طرف مائل رہی۔ خاص طور پر سندھ کے بزرگ صوفی ہفت زبان شاعر سچل سرمست کی بڑی معتقد تھیں۔ تصوف ہی ان کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا رہا۔ سادگی، خلوص، محبت اور انسانی مساوات کے اوصاف سے بھرپور شخصیت کی مالک تھیں۔ ان کا رہن سہن اور زندگی گذارنے کا انداز انتہائی صوفیانہ تھا۔ کبھی کسی کی دل آزاری نہیں کی، نہایت بے ضرر اور سب کا بھلا چاہنے والی خاتون تھیں امر جلیل کی پہلی عملی درسگاہ تھیں انہی کے ہاتھوں میں ان کی تربیت ہوئی۔ یہ تمام اوصاف امر جلیل کو بھی ورثہ میں منتقل ہوئے۔

بڑے بھائی

اپنے دادا کا نام رکھنے والے قاضی فیض محمد ان کے بڑے بھائی تھے ایک زرعی ماہر جنہوں نے ایم ایس سی ایگریکلچر نیو میکسیکو یونیورسٹی امریکہ سے کیا۔ آپ نے سندھ ایگریکلچر ڈپارٹمنٹ میں بطور ڈپٹی ڈائریکٹر خدمات سرانجام دیں اور انتہائی قابلیت محنت اور ایمانداری سے اپنا لوہا منوایا۔ علم و ادب سے انہیں گہرا لگاؤ رہا اور 56 سال کی عمر پائی اور دوران نوکری ہی انتقال کر گئے۔ آپ نہایت ہی پسندیدہ شخصیت کے مالک تھے۔

ایسے خاندان میں امر جلیل نے پرورش پائی اور خود ادب میں ایک ممتاز مقام حاصل کیا۔ ان کو برملا نابغۂ عصر Living legend کہا جاتا ہے۔ ان جیسی شہرت، کردار اور شخصیت دنیائے ادب میں بہت کم لوگوں کو نصیب ہوئی ہے۔

زندگی نامہ

امر جلیل کہتے ہیں:

''میں زندگی کو تحریر کی امانت سمجھتا ہوں۔ لکھے بغیر زندگی کا کوئی مقصد نہیں سوجھتا نہ ہی کوئی معقول مصرف۔ میں نے اکثر سنجیدگی سے سوچا ہے کہ جب کبھی مجھ سے فن تحریر چھین لیا جائے گا، جسے میں Talent exhausted کہتا ہوں، میں اس روز خودکشی کرلوں گا۔''

''میں اپنی زمین سے جڑا ہوا ہوں۔ یہ جوڑ میں توڑ نہیں سکتا۔ اس جوڑ کے آڑے آنے والے ہر رشتے کو میں توڑ سکتا ہوں مگر میں زمین سے رشتہ نہیں توڑ سکتا۔''

''زندگی تنہائیوں کا اٹوٹ سلسلہ ہے۔ کبھی کبھی یہ احساس شدت اختیار کر لیتا ہے کہ عمر کا ہر گزرتا لمحہ ایک تنہائی کا دوسری تنہائی کی سمت سفر ہے۔''

''میں نے بچپن سے خود کو بیقرار ہی پایا ہے، کوئی بے چینی میری روح میں سرایت کر گئی ہے مجھے کسی کروٹ قرار نہیں اور پھر یہ انجانی سی تڑپ کسک میں نے اپنے مقدس مقصد کے سپرد کر دی، میرا کرکٹ سے جنون کی حد تک لگاؤ بھی میرے مقصد کے آڑے آ رہا تھا، میں نے اسے بھی قربان کر دیا۔''

''مجھے صرف اتنا پتہ ہے کہ مجھے لکھنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ جب بھی متضاد خیالات میرے حساس وجود کو جھنجھوڑتے ہیں۔ یہ ناآسودہ بدحال سیاسی، سماجی اور اقتصادی حالات اور ان میں دن رات پستے ہوئے عوام جب میری بے تابی اور بے اطمینانی کو اور بڑھا دیتے ہیں تو میں لکھتا ہوں۔ لکھنا ہی میری پناہ گاہ ہے، اس بے معنی وجود کا مقصد لکھنا ہی ہے۔ میرا ادب درد اور تکلیف سے جنم لیتا ہے۔ میں جب تک کسی نظام کے لیے بے انتہا نفرت اور غصہ محسوس نہیں کرتا یا جس سے میری روح تڑپ نہیں اٹھتی تب تک میں نہیں لکھتا۔''

''دل کرتا ہے بس دوڑوں اور دوڑتا ہی رہوں، کبھی بھی کہیں بھی ایک پل کے لئے بھی نہ رکوں۔''

جنم (پیدائش)

ایسی سرکش اور باغی روح (امر جلیل) کا جنم 8 نومبر 1936 میں قاضی عبدالغنی صاحب کے گھر روہڑی میں ہوا۔ آپ کا خاندان بڑے قاضیوں والے نام سے نہایت مشہور اور باعزت سمجھا جاتا ہے۔ میٹرک این جے وی ہائی اسکول کراچی سے کیا۔ کراچی جہاں آپ کے والد نہایت ہی ایماندار اور ضدی افسر تھے۔ انٹرمیڈیٹ کے لئے ڈی جے سندھ سائنس کالج میں داخلہ لیا۔ مگر اس سرکش روح کے بے انتہا جوش کو بس کرکٹ اور اسپورٹس ہی آسودہ کر سکتے تھے۔ اپنے اسکول کالج اور یونیورسٹی کی کرکٹ ٹیمس کے کپتان رہ چکے ہیں۔ پاکستان کی انٹر یونیورسٹی ٹورنامینٹس میں ان کی وکیٹ کیپنگ کا رکارڈ اب بھی قائم دائم ہے شاٹ پٹ پھینکنے کا ریکارڈ بھی اب تک کوئی نہیں توڑ سکا جب تک وہ خود کالج یونیورسٹی کے طالب علم رہے۔ بی اے نوابشاہ سے کیا اور اکنامکس میں ماسٹر کراچی یونیورسٹی سے کیا، اور تاریخ میں ایم اے سندھ یونیورسٹی سے کیا۔

ملازمت

1961ء میں ایم اے کرنے کے بعد اکنامکس انیومریٹر کی نوکری Economic Affairs Division سکھر میں حاصل کی مگر تخلیق اور اسپورٹس کا انرجیٹک دماغ فائیلوں میں الجھ نہ سکا، بے قرار روح کو کسی کروٹ قرار نہ آیا، جلد ہی نوکری کو خیر باد کیا اور کراچی آپہنچے۔ کچھ وقت این جے وی ہائی اسکول میں پڑھایا پھر ملک سپلائے اسکیم میں مارکیٹنگ افسر کی نوکری کی۔ آخر اپنے فنکارانہ ذہن کو لے کر وہ ریڈیو پاکستان حیدرآباد 1966 میں پہنچ گئے جہاں انہیں کچھ کرنے کا صحیح موقع ملا، ایک ریسرچ افسر کے طور پر ٹیکنیکی کام بھی کرتے رہے اور لکھتے بھی رہے۔ پھر حیدرآباد سے کراچی منتقل ہوئے۔ پروگرام مینیجر کے طور پر کام کرتے ہوئے پھر حیدرآباد واپس آئے جہاں 1974 تک کام کیا پھر ترقی دے کر اسلام آباد ریڈیو بھیج دیا گیا۔ جہاں ڈپٹی کنٹرولر کے فرائض انجام دیئے مگر مشق سخن زور وشور سے جاری رہی۔ پھر 1975 میں علامہ اقبال اوپن

یونیورسٹی جوائن کی جہاں ڈائریکٹر ایجوکیشن ٹیکنالوجی رہے کہ ریڈیو ٹی وی کے ذریعے کس طرح علم کا پھیلاؤ ہوسکتا ہے۔

ڈائریکٹر جنرل پاکستان نیشنل کونسل آف آرٹس اور آخر میں وائس چانسلر علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی ہوئے جہاں سے سبک دوش ہونے کے بعد پھر آ کر کراچی آ بسے۔

شخصیت

کچھ لوگ اپنے وجود میں ادارہ ہوتے ہیں تو کچھ زندہ لیجنڈ بن جاتے ہیں۔ یہ فیصلہ مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ انسان بڑے ہیں کہ فنکار؟ عام طور پر بڑے فنکار بہت چھوٹے انسان ثابت ہوتے ہیں، دنیا ایسی شخصیات سے بھری پڑی ہے۔ قد آور فنکار، بڑے اعزازات انعامات، سند یافتہ، شہرت کی بلندیوں پر! قریب جا کر دیکھو تو شخصیت زمیں میں گڑی ہوئی۔ انسانوں کا بڑا قحط ہو گیا ہے۔ اس مشینی زندگی نے انسان کی منڈی کھول دی ہے، ہر ایک پر ایک ٹیگ لگا ہوا ہے، جتنا نام اتنا دام اور بکے جا رہے ہیں۔ کیا سیاست دان، کیا سائنسدان۔ قلمکار ہو یا افسر، استاد ہو یا انجینئر، ڈاکٹر ہوں یا ڈائریکٹر اس منڈی میں سب بکتے ہیں۔ چمکتے سکوں کی ریل پیل میں انساں کی ریس لگی ہے۔۔۔ جو جیتا وہی سکندر! مگر آج بھی کہیں کہیں یہ کھرے لوگ مل ہی جاتے ہیں۔ سچے، پرخلوص، معصوم اور مخلص جیسے بچے! ناقابل یقین حد تک ملنسار سادگی اور اچھائی کی جیتی جاگتی تصویر۔۔۔ اگر کسی کو یقین نہ آئے تو آ کر امر جلیل سے مل لے۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ''seeing is believing!'' میں خود چونک سا جاتا ہوں اور اس تحیّر سے اب تک نہیں نکل سکا کہ وہ فنکار بڑے ہیں کہ انسان۔۔۔ میں نے ان کے قلم کو چاہا بلکہ پوجا، انہیں محفلوں اور کانفرنسوں میں تلاش کیا ادبی مجالس میں صرف انہیں ایک نظر دیکھنے کو بھٹکتا رہا، صاحب قلم لوگوں سے پوچھتا رہا۔۔۔ کہا وہ کسی سے ملتے نہیں، مجالس میں آتے نہیں اور وقت ضائع نہیں کرتے بس کام اور کام۔۔۔ پڑھنے لکھنے سے انہیں فرصت نہیں۔ برباد کرنے کو ایک گھنٹہ نہیں ۔۔۔ بڑا مایوس ہوا مگر جب ملا تو جنم جنم کے ساتھی لگے، اپنی سوچ سے بھی زیادہ شفاف! پہاڑی

نالے کی طرح آر پار دیکھ سکتے ہیں انہیں۔ آئینہ تو گرد آلود بھی ہوسکتا ہے انہیں 73 برس کی عمر نے ابھی بوڑھا نہیں کیا۔ ان کی قربت پا کر بس خود پر فخر محسوس ہوتا ہے۔

وہ بچے کی مانند اجلے معصوم اور شریر ہیں۔ انکساری، عاجزی، انس اور محبت کی تصویر! جب انہیں سراہا جائے تو شرما جاتے ہیں۔ Standing ovation پر جب نہ رکنے والی تالیوں سے ان کا استقبال کیا جاتا ہے تو ہاتھ جوڑ کر رو دیتے ہیں، گھنی داڑھی کے سفید بال موتیوں سے منور ہو جاتے ہیں، سر جھکا لیتے ہیں اور کچھ بھی کہہ نہیں پاتے۔ دل میں بسا صدیوں کا درد، تنہائی سے بے چین روح اور تضادات کا شکار یہ معاشرہ! ناانصافیاں، غیر انسانی عمل دہشت ناک و دل سوز خودکشیاں اور اب یہ خودکشی بم دھماکے! اک حساس دل، دماغ کا کیا حشر کرتے ہیں ان کے کالم کہانیاں خوب بیان کرتی ہیں اور بڑی ٹریجڈی پر لکھا ہوا ان کا ناول ''آخر گونگا بول پڑا'' اپنے عنوان سے تشدد کی گہرائی اور بربریت بیان کر رہا ہے۔ مقدمے دھمکیاں اور ذہنی عذاب ان کی شخصیت کے نکھار اور ارادوں کی مضبوطی کا کچھ نہیں بگاڑ سکے۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ اتنے دباؤ، وارنٹس اور دھمکیوں پر آپ کیا کہیں گے تو آپ نے جواب دیا۔

''میں تحریر کی آزادی اور اپنی ذاتی آزادی کی جنگ لڑ رہا ہوں، یہ صرف میری جنگ ہے اور مجھے تنہا ہی جیل کے اندر اور باہر یہ لڑائی لڑنی ہے۔ میں اپنی پہلی کہانی اندرا سے لے کر آج تک لکھی ہوئی ہر تحریر کے ہر لفظ کا ذمہ دار ہوں اس پہ قائم ہوں اور کمیٹڈ ہوں۔ میں اپنے کنوکشن سے لکھتا ہوں اور ہر صورتحال کا سامنا کرنے کو تیار ہوں۔''

''وفا'' ان کی شخصیت کی خوشبو کا ایک پہلو ہے۔ وہ وفا کے پیکر ہیں، کمٹمنٹ کے سچے اور کھرے انسان ہیں۔ کرکٹ کی دنیا سے ادب کی وادی میں آنے کے بعد جلیل قاضی اور جلیل پریمی جیسے ناموں سے لکھنے لگے۔ پھر اپنے گہرے دوست قمر شہباز جن کی صحبت انہیں اس دنیا میں کھینچ لائی، سے اپنے پیار کا اظہار کچھ اس طرح کیا کہ قمر کا ہم قافیہ لفظ امر ڈھونڈ کر اپنے ادبی نام کے ساتھ جوڑ دیا۔ یوں اس نئے سفر کے آغاز کو اپنے ساتھی سے ہمسفر کیا۔ 1955 میں ان کی

پہلی کہانی اندرا'' ادا'' نامی رسالے میں نوابشاہ سے شائع ہوئی پھر ان کی تحریریں با قاعدگی سے واپس آتی رہیں مگر وہ لکھتے رہے یہ وفا کا سفر جاری رہا اپنی کہانیاں دوسروں کے نام سے بھی شائع ہونے پر رضامند رہے مگر لکھنا نہ چھوڑا۔

جب آ کے 1961 میں ان کی طرز تحریر کو مان ملا اور پھر وہ ایسا لکھنے لگے جیسے موسلا دھار بارش ہو، لوگوں نے ان کی تحریروں کو ہاتھوں ہاتھ لیا، کوئی میگزین، ماہوار رسالہ، کتاب یا سہ ماہی رسالہ ایسا نہ تھا جس میں امر جلیل نہ ہوں! کہتے تھے ان کے مٹکے بھرے ہوئے تھے اور ہر مانگنے والے کو ہاتھ ڈال کر کچھ نہ کچھ دے ہی دیتے تھے۔ جتنی تیزی سے وہ آئے طوفاں کی طرح چھائے اور فتح کر لیا، ادبی میدان مار لیا، ان کے ہمعصر ان سے جلنے لگے جس کا برملا اظہار انہوں نے کئی مرتبہ بانگ دہل بھی کیا، ان کے سھٹي نمبر میں بھی لکھا۔ تو اپنے آپ سے، شریک حیات سے، دوستوں سے، اپنے پیشے سے اور اپنے فن (قلم) سے ان کی وفا قائم دائم ہے جوان کی بھرپور شخصیت کا خاصہ ہے۔ وہ کسی کا دل نہیں دکھا سکتے، چاہے وہ ان کے مخالف ہی کیوں نہ ہوں۔ میرے عزیز دوست مرحوم انور پیرزادہ نے امر جلیل کے لیے لکھا:

''امر سندھ دھرتی کے مظلوم انسانوں کا ترجمان ہے وہ انقلابی ساتھی ہے جو ادب کے محاذ پر ہمیشہ ان کے ساتھ آخر تک لڑتا رہے گا، آخری منزل تک ثابت قدم رہے گا بھلے ان پر کتنا ہی دباؤ کیوں نہ ڈالا جائے، پا بجولاں کیوں نہ کیا جائے۔ ان سے سیاسی اختلافات اپنی جگہ مگر یہ قبول کرنے میں مجھے ذرا سی بھی جھجک نہیں ہو رہی کہ سندھی قوم نے جس بھی جنم میں انقلاب لائی اور استحصال اور ظلم کا خاتمہ کیا امر اس انقلاب کا آئینہ دار ہوگا۔''

مرحوم انور کے یہ الفاظ مجھے تاریخی حقائق یاد دلاتے ہیں کہ فرنچ ریولیوشن کے نقیب روسو اور والیٹر نہ ہوتے تو بسٹائل کبھی بھی مسمار نہ ہوتا، ٹالسٹائی، ترگنیف، گوگول اور چیخوف نہ ہوتے تو روسی انقلاب ایک صدی اور پیچھے چلا جاتا وغیرہ وغیرہ۔

تو امر جلیل ایک لونگ لیجنڈ اور تاریخ ساز شخصیت ہی ثابت ہونگے۔ تحریروں میں ان

کی بغاوت، مضبوط قوتِ ارادی، استحکام اور کمٹمنٹ یکساں ملے گی وہ اردو کالم ہوں یا انگریزی تحریر، ڈرامہ یا ناول ہو وہ ہرجگہ انسانی اعلیٰ قدروں اور اخلاص کے اعلیٰ معیاروں کو اونچے اٹھانے کی سعی ، ہر تشدد استحصال، ظلم اور نا انصافی کے محاذ پر قلم کا کلاشنکوف لئے ہوئے، اکیلے صفوں پر بھاری ہیں۔ ہر سچ اک نسبتی ہے" Every thing is relatively true" یہ ایک علم کی بات ہے، پھر بھی اپنے اپنے پیرا میٹرز ہوتے ہیں۔ میرے نظریے اور سوچ میں امر جلیل کی عظیم شخصیت تین پہلوؤں پر مبنی ہے۔

1۔ عزت نفس

2۔ انکساری

3۔ عدم خود پرستی

1۔ وہ چڑھتے سورج کے قطعاً پجاری نہیں۔ کسی منصب یا عہدے کے لئے کسی کی خوشامد کرنا اس کے مزاج میں نہیں۔ انہوں نے کبھی کسی عہدے کے لئے کسی سے سفارش نہیں کروائی۔ بلکہ بعض اوقات تو ایسا بھی ہوا کہ انہیں کوئی عہدہ پیش کیا گیا تو انہوں نے اس سے معذرت کرلی۔ انہوں نے عزتِ نفس کو ہر چیز پر ترجیح دیا۔ بقول اقبالؒ

"خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر"

2۔ عاجزی اور انکساری تو ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ اپنے چاہنے والوں سے ملتے ہیں انہیں گلے لگا لیتے ہیں لگتا ہے لوگ وہ نہیں بلکہ یہ (امر جلیل) انکے مداح ہوں۔ زیادہ تعریف کرو تو شرما کر سر جھکا لیتے ہیں جیسے جرم کیا ہو! محفل میں بے تحاشا استقبال اور بے انتہا داد ملے تو رو پڑتے ہیں۔

3۔ انسان کی بڑھتی ہوئی خودی، اس کا تکبر، اس کی انا پرستی اور خود پرستی اس کا بنیادی عنصر ہے۔ اس کو میں انسان کا Manufacturing defect کہتا ہوں کہ وہ خود کو سب سے برتر سمجھتا ہے، صرف خود سے پیار کرتا ہے، صرف اپنا خیال رکھتا ہے اور اپنی ہی غرض سے مطلب رکھتا

ہے۔دوسروں سے سارے تعلق اسی وجہ سے رکھتا ہے کہ جہاں سے زیادہ فائدہ، وہیں زیادہ آنا جانا اور گرمیٔ تعلقات کا معیار بھی یہی ہوتا ہے۔

''کچھ عرصہ قبل میں، امر جلیل اور شیخ عزیز صاحب ڈان اخبار میں شاہ عبداللطیف بھٹائی کے انگریزی ترجمے کے سلسلے میں اکٹھے کام کرتے تھے۔ہم ایک الگ کمرے میں یکسوئی کے ساتھ سوچ سوچ کر کام کر رہے تھے تو گاہے بگاہے باہر دو عورتیں اپنے سیل فون پر زور سے باتیں کرتیں، کبھی ہمارے کمرے میں آجاتیں جس سے ہمیں پریشانی کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا، میں نے کہا کہ ''خیالات کا سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے اور ہم ڈسٹرب ہو جاتے ہیں۔'' امر جلیل صاحب نے فوراً کہا ''ہاں، ہم انہیں کتنا ڈسٹرب کر رہے ہیں ہم ان کے کام میں مخل ہو رہے ہیں۔'' میں بہت متاثر ہوا کہ سوچنے کا یہ انداز کتنا مثبت ہے۔''

خود کو کچھ نہ سمجھنا اپنی پرستش نہ کرنا یہ نہایت کٹھن بلکہ ناممکن کام ہے۔انسان کی پیدائش ہی خودغرضی کی مٹی میں انا کا پانی ڈال کر کی گئی ہے۔ امر جلیل کی اصل شخصیت شاہ سائیں کہ اس شعر کے مصداق ہے۔

تمھیں ڈھونڈوں اور ڈھونڈھتا رہوں، کبھی پا نہ سکوں
کہ مبادا تیرے ملنے سے میرے من کی پیاس کہیں بجھ جائے!

☆☆☆☆☆☆

میں تمہیں تلاش کروں اور تم نہ ملو
یہ عرض مان لو میری
تیرے ہجر میں میرے محبوب
مجھے موت آجائے

کسی کو خود سے زیادہ چاہنا اور بس چاہے جانا، ملنے یا پانے کی فکر سے بعید۔ یہ وہ راستہ ہے جس کی کوئی منزل نہیں۔طلب اور طلب دوام اس تمام تگ و دو کا ماحصل ہے۔ پر وہی تسکین نہ پا سکنے والی تشنگی ہے جو عشق مفرط کی شورشوں کے اندر سے بھڑک اٹھتی ہے جسے شاہ لطیف کے الفاظ میں سمندر بھی بجھا نہیں پاتا، پانی جسے اور پیاسا کر دیتا ہے۔

"It is better

To have loved and lost

than never to have loved at all." (Tennyson)

پانا نہیں، چاہنا ہی زندگی ہے۔ وہ بہت ہی وفا شعار ہیں۔ ان کی ساری کہانیاں محبوب کو اپنے آپ سے بڑھ کر چاہنے پر مائل کرتی ہیں۔ اپنی ایک کہانی میں رقم طراز ہیں۔

''ناز اگر میں مر جاؤں اور مؤن جودڑو بن جاؤں تو آج سے پانچ ہزار برس بعد لوگ میرے وجود کے کھنڈر سے تیری یاد کی باقیات کھود کر نکالیں گے۔''

اور وہ خود ایسے ہی ہیں۔ ایک دفعہ مجھے ایک ایسا جملہ کہا جسے میں دیر تک سوچتا رہا اور آج بھی اس کے مزے لیتا ہوں۔ ''میں آئینے سے اپنی جان چھڑا چکا ہوں'' ہم خود کو ہی تو چاہتے ہیں، سارا وقت سجنا سنورنا ہر جگہ آئینہ ہو تو خود کو دیکھنا بس ایک ہی فکر کھائے جاتی ہے ''میں کیسا لگتا\ لگتی ہوں'' تاکہ دوسروں کی نگاہوں کا مرکز بنوں۔ اور وہ اس خواہش سے ہی خالی ہو گئے ہیں۔ اس پر قابو پا لیا ہے۔ گھر میں ہوں یا انٹرویو میں ہوں، کسی محفل میں ہوں یا ٹی وی اسٹوڈیو میں، خود پر نظر پہنچی Self conscious نہیں، تو بلا کے پر اعتماد لگیں گے۔

انہیں کبھی بھی کپڑوں کا کریز اور کیمرہ کا خوف نہیں رہا۔ وہ ہر جگہ انتہائی پر سکون ہوتے ہیں۔ جب اپنی فکر نہیں کہ لوگوں سے داد وصول ہو! تو یہ آگہی نفس ایک عظیم خزانہ ہے جو کسی کسی کے نصیب میں آتا ہے۔ بلاشبہ وہ بہت بڑے آدمی ہیں۔

نظریہ

امر جلیل کا نظریہ ہی ان کی اصل شخصیت کا آئینہ دار ہے۔ وہ انسانیت پر یقین رکھتے ہیں۔ مذہب، فقہ، زباں وغیرہ کے دائروں سے اٹھ کر اعلیٰ انسانی اقدار ہی ان کا نظریہ ہے۔ وہ سچل سرمست کے مرید ہیں یہ عشق انہیں اپنی امی جان سے ملا ہے، ان کے والد صاحب بھی کٹر مذہبی، نہ تھے نہ کبھی ان پر جبر کیا کہ یوں کرو یا نہ کرو مگر ان کی والدہ ماجدہ سچل سرمست کی بڑی پیرو تھیں اور امر جلیل کا اپنا سچ بھی اس سچ سے ملتا ہے۔

سچل سرمستؒ کا فلسفہ

ضلع خیر پور سے ایک میل کے فاصلے پر رانی پور کا ریلوے اسٹیشن ہے جہاں ایک گاؤں ہے ''درازا'' وہاں ایک جاذب نظر باغ کے گھنے پیڑوں تلے ایک خوبصورت گنبد نظر آتا ہے۔ یہاں بستے ہیں ہمارے سچے صوفی سچل سرمست ۔جنہیں ہفت زبان شاعر کہتے ہیں۔سندھی، سرائیکی، اردو اور فارسی میں ان کا کلام شاہ لطیف جتنا ہی ضخیم اور زبان زد عام ہے۔آپ کے والد ماجد صلاح الدین آپ کے بچپن میں ہی انتقال کر گئے۔آپ کے دادا کا نام عبدالوہاب تھا، خاندانی رسم ورواج کے مطابق آپ کو بھی اسی نام سے نوازا گیا۔آپ کی سچ گوئی اور صداقت کو دیکھ کر آپ کو سچل یعنی سچا کہا جانے لگا، اور واقعی آپ بے باک سچ بولنے والے ہیں۔'' مرد سچ ہی کہتے ہیں کسی کو پسند آئے نہ آئے'' کا نعرہ آپ کا شیوہ ٹھہرا۔بچپن میں آپ پکے پابندِ شرع یعنی صوم وصلوۃ حج، زکوۃ کے داعی مگر جلد ہی ظاہر اُرسم ورواج سے اکتا گئے کہ سچ تو کچھ اور ہے جسے مراقبے میں ہی پایا جاتا ہے۔آپ کے نزدیک لفظ ''اللہ'' محبت و پیار کا نام ہے۔اس کی سچی چاہت ہی عین عبادت ہے اور اس کے سوا تو کوئی ہے ہی نہیں۔آپ فلسفۂ وحدت الوجود کے قائل تھے۔حقیقت کا برملا اظہار کرنے پر وقت کے علماء آپ کے دشمن بن گئے مگر آپ نے کوئی پرواہ نہیں کی اور نعرہ لگا دیا'' بھلے منصور کی طرح مار دیں، ہم وحدت کے گلاب ہی بنیں رہیں گے۔' آپ کو سچو سچل اور سچڈنو (سچے کی دین) بھی کہا جانے لگا اور تخلص پڑ گیا سرمست کہ یہ سچ سر چڑھ کر بولتا ہے۔ کچھ تاریخ دانوں کا خیال ہے کہ انہیں مختلف حالات ملے ورنہ انہیں منصور الحلاج کی طرح قتل کر دیا جاتا! سچائی کو ببانگ دہل کہنا، سب کو حق ماننا اور انسانیت سے پیار بلا تمیز رنگ، مذہب، فقہ اور زبان کے کون برداشت کرتا ہے۔صرف کہا جاتا ہے، تبلیغ بھی کر دی جاتی ہے مگر مانتا کون ہے؟ انہوں نے مان کر دکھایا اور یہ ایمان عملی زندگی میں جی کر دکھایا۔

اِدھر اُدھر نہ نہار (دیکھو)

یار تو تیرے پاس بسا ہے

ساتھ سدا ہے تیرے ہی
رہیت نہیں اس پار
اپنے آپ میں ڈھونڈ اسے
بن میں نہ جا بیکار
پوچھ نہ پریتم کی دوری
سجوا اپنا آپ سنوار

☆☆☆☆☆

''کہ مذہبوں نے ملک میں عوام کو الجھایا
شیخوں، پیروں اور پنڈتوں نے بھی بہکایا
کچھ نے جھک کر نمازیں پڑھیں
کچھ نے جامندر بسائے
کچھ نے بنالی خانقاہیں
کچھ نے دیول بنائے
قریب مگر نہ آئے
عقل والے عشق کے!''

☆☆☆☆☆

''انسان اصل میں ہے قالبِ عشق
ارشاد ہے ''میں نے آدم کو اپنی شکل پر خلق کیا''
اور پورا سچ بھی یہی ہے کہ
''میں آدم کا راز ہوں اور آدم میرا''
سچو یہ پورا سچ کہہ دو
منافقت مت کرو کہ پروردگار
یہاں وہاں ایک ہی ہے''

☆☆☆☆☆

وقت یہی ہے یہی سماں ہے

دوری کو تم دفع کرو

مذہب کو من سے نکال کر

ہندو، مومن سے محبت کرو

ایسا نہ ہو کہ عمر کا سورج

مغرب میں غروب ہو جائے

☆☆☆☆☆

عاشق جلا دے آگ میں

ساری کتابوں کے ورق

اک نام میرا یاد کر

یہ دوست کا پیغام ہے

☆☆☆☆☆

آخر یہ مطلب پا لیا

مرشد نے ہم سے یہ کہا

بن عشق دلبر کے بچو

کیا کفر کیا اسلام ہے

☆☆☆☆☆

بھٹکو مت سچل عالم اسرار میں

یہاں وہاں وہ ایک ہی بستا ہے

میں حق ہوں، یہی سچ ہے

بے شک ہے یہ حقیقت جو مرشد نے سکھائی ہے

☆☆☆☆☆

ہر صورت میں وہ حق ہے

دوستو! کیا کوئی چراغ لے کر سورج کو ڈھونڈتا ہے
سورج تو دھوپ میں دیکھا جا سکتا ہے
وحدت اور کثرت تو بارش اور بوندوں کی مانند ہیں
سچو کے نام میں ہی یہ سچ مضمر ہے
سارے چہرے اسی کے چہرے ہیں
اور اپنا تماشا وہ خود دیکھنے آیا ہے
کہیں جمبل کہیں مالک اور کہیں شفیع کہلایا
کہیں زمان تو کہیں ہنومان کہنے میں آیا
کہیں بیٹھا گیتا پڑھتا ہے تو کہیں قرآن
نعرۂ اٹھانا الحق کہیں تو نظر آیا کہیں
کہیں بچہ کہیں گھبرو جوان کہیں بوڑھا دکھائی دیا
وزیر کہیں تجھے پر، تو دوسری جگہ چوکیدار نظر آیا
کہیں احمد ہوا میم کے بغیر
مشاہدے یہ اس کے دیکھے، سچو کی عقل ہوئی چراغ پا

☆☆☆☆☆

محبوب کو تلاش کرو من میں
اپنے دل میں اپنے تن میں
کیا ساز بجایا ہے کن فیکوں کا
بھٹکتے کیوں ہو دشت میں
وہ بستا ہے من مندر میں
راز رکھا اپنے اندر میں سچو
وہ رہتا ہے ہر جگہ، جگہ میں

☆☆☆☆☆

تمھیں ساری دنیا جانتی ہے
اور دل و جاں سے مانتی ہے
کیا رکھا ہے اس شہرت میں
گر دل کی دھڑکن وحدت سے گونج اٹھے
تبلیغ کرنے سے تو منصوری معراج نہیں ملتی
صرف دکھاوے کے لئے ہی نعت خوانی کی جاتی ہے
نفل، نماز، ورد، وظیفے اور باہر کے پہناوے
سب کھیل تماشے ہیں دھن دولت کی لگن کے
ماسوائے عشق اللہ کے سچو
ظاہر اُلبادہ عبث ہے!

☆☆☆☆☆

الف سے آدم بنا، چھایا بڑا شور وغل
بھول مت جاؤ بھول بھلیوں میں
ہندو مومن ہیں ایک ہی الف کا اظہار
کہ میں نے آدم کو اپنی ہی صورت پر خلق کیا
حق کا گلاب بنو، گو ماردیں منصوری کی مانند

☆☆☆☆☆

میں نے اللہ کو دل اندر پایا
تو کعبے جانے کی کیا ضرورت؟

☆☆☆☆☆

اینجھا (ایسا)
کم (کام)
کریجے (کیجئے)

کہ اللہ

آپ

بٹیجے (بنیں)

تو حق سچ وحدت اور رب العالمین کا جو کلمہ حق سرمست نے پڑھا اور خوب پڑھایا وہ امر جلیل کو اس کی ماں سے ورثے میں ملا، ویسی ہی تربیت کی گئی پھر سندھ کی صوفی مٹی کی بناوٹ جہاں ہر عبادت کے بعد دعا کی جاتی ہے!

''اے رب رحیم ہر ہندو مسلمان کی خیر ہو!'' پھر بچپن سے ان کا تھیا سوفی سوسائٹی جانا، تصوف، انسانی حقوق اور عالمی ادب کے آبدار موتی چننا اور سب سے بڑھ کر ان کا die hard جمہوریت پسند ہونا، جو خود کے لئے پسند کرو وہی دوسروں کے لئے چاہو کے مصداق عمل پیرا ہونا، خود کو دوسروں میں دیکھنا، empathy کرنا یعنی درد مشترک رکھنا، وہ مزدور کا ہو یا موچی کا، کلرک کا ہو یا بادشاہ کا۔ ان کی زیادہ تر کہانیاں نچلے طبقے کے ادھورے پن، محرومیوں اور مجبوریوں کی آئینہ دار ہیں، جیسے میں نے یہاں ان کی ایک کہانی ''سرابوں کی تلاش'' دی ہے۔ یہی تحریر یہی انداز ان کا یہی اسلوب ہر دل کو موہ لیتا ہے۔ سچل کی سچائی سے معمور وہ ایک عمدہ انسان ہیں، صاحب دل ، صاحب کتاب ہونا تو اتنی بڑی بات نہیں وہ صاحب شعور ہیں۔

امر جلیل کی شخصیت اور فن

گلوبل ورلڈ اور انفارمیشن ٹیکنالوجی کی یہ 21 ویں صدی اپنے جدید تقاضوں کے ساتھ نت نئے مسائل لیکر ہمیں للکار رہی ہے ۔ جہاں طاقت کا توازن ہی سب کچھ سمجھا جاتا ہو! بدقسمتی سے ہم اس طاقت کی بالا دستی کے حلقۂ اثر سے باہر نہیں نکل پا رہے ۔ ہمیں نئی سوچ اور نئی فلاسفی تلاش کرنی ہے جس سے ہم جدید دنیا کے مسائل کا سائنسی حل تلاش کر سکیں ۔ وہ بے شمار سوالات جو ہمارے سامنے سر اٹھا کر کھڑے ہیں ۔ مثلاً یہ فروانی کے درمیان افلاس کیوں ہے؟ عالیشان عمارتوں کے بیچ جھگیاں کس لیے؟ اوزون تہہ کا ٹوٹنا ،آلودگی سے فضا اور ماحولیات کا زہریلا ہونا ! یہ ہر سو پھیلی ہوئی قتل اور دہشتگردی ! خودکش بم دھماکے اور پھر روز افزوں آبادی کا دھماکا ! جدید میزائل ٹیکنالوجی اور میرین تجربات اس کرۂ ارض پہ کیا کیا اثرات چھوڑیں گے ؟ اس زمین کے چھوٹے سیارے پر بنی نوع انسان کا جینا آخر کیوں محال ہوتا جا رہا ہے ؟؟؟ نوکلیائی منڈیوں کی تجارت آخر ہمیں کہاں پہنچائے گی ؟ انسانیت اور انصاف کہاں ملے گا ؟ نیکی اور جمالیات کس سیارے پر پائے جائیں گے ؟ آخر انسان کے خوابوں کی تعبیر اور خواہشوں کی تکمیل کب ہو گی ؟ یہ اہرمن ویزداں ، خیر و شر کروٹ بدل بدل کر ہم کو ہی آخر کیوں پکڑتے ہیں؟ عصری سائنس نے بنی نوع انسان کی سوچوں کو ناتواں کر دیا ہے ، اب ہمیں زندگی نا بودی کی طرف گامزن نظر آتی ہے اخلاقی معیار الٹ پلٹ ہو گئے ہیں ۔ اقدار تغیر کا شکار ہیں ! عہد حاضر کے تمام مسائل صحت، تعلیم اور غربت سے جڑے ہوئے ہیں ۔ جنوبی ایشیا میں ان کی بڑی وجہ اربوں ڈالر کے دفاعی اخراجات ہی ہیں ۔ جاپان پر پہلا ایٹم بم گرنے کے بعد آئن اسٹائن

نے کہا ''سب کچھ بدل گیا ہے لیکن انسانی سوچ نہیں بدلی'' اور آج بھی انسان The fittest survive یا "Might is Right" کے چنگل سے نہیں نکل سکا۔ آج پھر شیکسپیئر کے As You Like it کی صدا متوجہ کر رہی ہے کہ شہر انسانی دہشت، ظلم، ناانصافی اور بربریت کی آماجگاہ ہے ۔ بچنا ہے تو جنگل میں آجاؤ۔

Come hither come hither Here shall he see, no enemy but.

Winter and rough weather.

چلے آؤ اور جیئو! چار صدیاں اور آٹھ سال گذرنے کے بعد انسانی وحشت بڑھ کر خودکش بم دھماکوں کی طرف آ پہنچی ہے۔ بیشک ہم نے ظلم، تباہی اور بربادی بنانے میں ہی ترقی کی ہے۔ باہر کی آنکھیں چکا چوند کرنے والی یہ جگمگاتی روشنیاں اندر کے گھٹا ٹوپ اندھیروں اور حرص ہوس کا کچھ بھی بگاڑ نہیں پائیں۔ انسان نہیں بدلا اور نہ ہی بدلے گا۔ ادب ہی وہ آئینہ ہے جس میں اس کے اصل چہرے کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ ہر صدی میں لکھے جانے والا ادب ہی وہ سچی دستاویز ہے جس میں انسانی معاشرے کی اصل تصویر نظر آتی ہے تاریخ تو سوائے واقعات اور ہندسوں کے شماریات کے جھوٹ کا ایک پلندا ہے۔ شاید اسی لئے ارسطو نے کہا۔ Poetry is more Philosiphical than history جس دور کا بھی مطالعہ کرنا ہو تو ادب سے کیجیے ادیب ہی ان واقعات کا چشم دیدہ امین ہوتا ہے جسے وہ رقم کرتا ہے۔ آج کے ادیب امر جلیل کے تحریروں کا مطالعہ کرنے سے پہلے اس عصر حاضر کا سماجی معاشی اور سیاسی مطالعہ ضروری ہے تا کہ وہ کہانیاں، ڈرامے، کالم اور مکالمے ہمیں سمجھ میں آئیں جس کے تیز طرار دھارے نے ہمارے ادیب کو لہولہان کر دیا ہے۔ کبھی تو وہ مکمل سکتے میں آجاتے ہیں اور کبھی جمود اسی طرح ٹوٹتا ہے کہ ان کے ناول کا عنواں ہوگیا۔ ''نیٹ گونگي ڳالهايو''

آج کی دنیا جو بربریت، وحشت، ظلم اور دہشت کے ایک پاٹ کے نیچے بھوک، افلاس، جہالت اور ناانصافی کے دوسرے پاٹ کے درمیاں پس رہی ہے۔ روزانہ خودکشی اور خودسوزی کی خبریں سننے کو مل رہی ہیں ۔ ہم آج معاشی، سماجی، سیاسی اور اخلاقی مسائل میں الجھ کر رہ

گئے ہیں ۔صنعتوں کی ترقی سے مالیات نے جنم لیا، گلوبل تجارت نے استحصال کی شکل زیادہ پیچیدہ کر دی جس سے ٹیکنالوجی دریافت ہوئی اور پس ماندہ ممالک جدید غلامی میں جکڑے گئے ۔طبقاتی تقسیم مزید بڑھ گئی ہے۔آج سرمائے نے جمہوریت کو بھی اپنی داشتہ بنالیا ہے۔

سرمایہ داری نظام نے اپنی معیشت کو مسلح کر دیا۔ مارکس نے اس کے مقابلے میں سوشلزم کا نظریہ عوامی طاقت سود اور منافع کے خاتمے پر رکھا جہاں ذرائع پیداوار مشترکہ ملکیت قرار پائے اور ورکر کی اہلیت مطابق معاوضہ طے پایا۔مگر روس کو اندرونی اور بیرونی سازشوں کا شکار کر کے یہ نظام تلپٹ کر دیا گیا۔آج کے دور میں لالچ، ہوس اور خودغرضی کو ایک مثبت رویہ گردانا جا رہا ہے، جہاں اجارہ دار منافع کا غلام بن کر مزید بے رحم ہو گیا ہے، ہم ہیروئن، چرس اور گٹکا فروخت کر کے انسانی زندگیوں سے کھیل رہے ہیں ۔انسان منافع اور کرنسی کے سامنے بے وقعت ہو گیا ہے ۔انسانی جذبات، خواہشات اور احساسات نفع اور لالچ کے آگے ہیچ ہیں ۔سچ، ایمانداری، محنت اور شرافت کو تجارت، منڈی، کرنسی اور اسٹیٹس کے مگر مچھ چیر پھاڑ کر نگل رہے ہیں۔کرنسی کی تجارت اور اسٹاک مارکیٹوں نے پیداوار سے زیادہ ''زر'' کا حجم کر دیا ہے جس سے مہنگائی اور افراط زر عام ہو گیا ہے کام اور تفریح میں توازن نہیں رہا ۔ مقابلے کی دوڑ نے انسان کی توانائیوں کو روند کر رکھ دیا ہے۔متوازن غذا اور پینے کا صاف پانی تیسری دنیا میں نایاب ہو گیا ہے ۔سوشلزم میں سماجی انصاف اور اخوت کلیدی نقطۂ نظر تھا جبکہ سرمایہ داری میں یہ منافع پر بوجھ مانا جاتا ہے ۔جہاں چیف جسٹس انصاف مانگنے شہر شہر در بدر ہو اور حق کی آواز بلند کرنے والے پابندِ سلاسل ہوں ، جہاں چادر اور چار دیواری کا تقدس پائمال ہو رہا ہو ایسے مرئی اقدار میں ایک فنکار کیا رقم کر سکتا ہے ۔سوائے محرومیوں مجبوریوں کی داستان کے ۔۔۔کہانی ''منهنجي دل موهن جو دڙو ''میں دو پیار کرنے والے کہتے ہیں ''ہماری شادی میرے باپ اور تمہارے ڈیڈی کے سماجی طبقوں کا فٹ بال میچ ہے جس میں میرا باپ زخمی گول کیپر ہے ۔ میں طبقاتی کشمکش کی اس دلدل سے نکل نہیں سکتا اور اونچا اٹھ کر تمہارے خاندان سے ہم پلہ نہیں ہو سکتا۔''

اب آن لائن تجارت میں محنت کش اور صارفین کے درمیان چالاک تجارتی و صنعتی حلقے آ گئے۔ بینکاروں نے سودی نظام سے عوام کی قوت خرید کو ناتواں کر دیا ہے۔ اب دنیا کو مالی بحران کا سامنا ہے اور پاکستان دیوالیہ ہونے سے بچنے کے لئے آئی ایم ایف کے آگے گھٹنے ٹیک رہا ہے۔ یوں اسٹاک ایکسچینج اور کمپنیوں کی دنیا قائم کی گئی ہے، جس میں قرضے اور لیزنگ کی لالچ نے صارف کی آنکھوں کو چکا چوند کر دیا ہے اور وہ یہ نہیں دیکھ سکتا کہ فی کس قرضہ کتنا بڑا ہے اور فی کس آمدنی کہاں کھڑی ہے۔ ریاست اب یہ نہیں سوچتی کہ تعلیم کے ذریعے اچھا فرد پیدا کیا جائے بلکہ ایسا نصاب وضع کرتی ہے کہ نئی نسل کارپوریٹ سرمایہ داروں کے منافع بڑھانے کا ایندھن بنے اور اسے وقت کا احساس نہیں ہے۔ تہذیب، کلچر، مشرقی اقدار، محبت، قربانی، ایثار، آداب، ادب اور سماجی رسوم اب کسی انجانی دنیا کی باتیں لگتی ہیں۔ پڑھنے کی عادت کھانے کی عادت میں بدل چکی ہے، ذہنی غذا کو زبان کا چسکا چاٹ چکا ہے۔ لائبریری اور کتب فروشی کی جگہ فوڈ آؤٹ لیٹس نے لے لی ہے۔ اب رات رات بھر فوڈ اسٹریٹس میں رت جگا ہوتا ہے۔ ہم مشینی انسان بن کر خود کو سرمائے کی گلوبلائزیشن فیکٹری کا ایندھن بنا رہے ہیں، انسانی اقدار حقوقِ آدم اور اظہار آزادی کا فقدان بڑھتا ہی جاتا ہے۔ فرانسیسی فلسفی ژاں پال سارتر نے کہا۔

''ہم بڑی دنیا کے دانشور انسانی حقوق کی بڑی بات کرتے ہیں، لیکن تیسری دنیا میں کوئی بڑا انسان پیدا ہوتا ہے تو اسے قتل کروا دیتے ہیں۔''

سارتر کا یہ قول ہم پر کتنا صادق ہے۔ یہاں جو بھی بڑا آدمی پیدا ہوا ہم نے اسے قتل کروا دیا۔ یہاں صنعتی اور مالیاتی سرمایہ نے جمہوریت کو آہنی دروازے میں قید کر رکھا ہے۔ اقدار کا آئینہ دھندلا چکا ہے، علم اور دانش کو مال و زر کی دیمک لگ چکی ہے، اب انا کی خون ریزی کا بازار گرم ہے، جہالت اور غربت، بے روزگاری کی وجہ سے مسائل بہت پیچیدہ ہو چکے ہیں۔ حسن و جمال نیکی اور اعلیٰ آفاقی اقدار بس ادب میں ہی پائے جاتے ہیں۔ میوزک، پینٹنگس، اسکلپڑ، ڈانس شاعری اور تھیٹر ہم میں پھر وہ اقدار اجاگر کر سکتے ہیں۔ ادب کی جمالیاتی دنیا پھر سے پتھر کو موم بنا سکتی ہے۔ احساس جگا سکتی ہے، انسان بنا سکتی ہے جو اب ایک برانڈیڈ روبوٹ بنا دیا گیا ہے۔

مشرق میں ابھی اتنی دیر نہیں ہوئی واپسی اب بھی ممکن ہے۔ غالب نے کہا۔

''دل ڈھونڈھتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے''

آیئے ادب کے اسی سنگِ میل کو سمجھنے کی کوشش کریں جس کا نام امر جلیل ہے اور جو بیک وقت انگریزی، اردو اور سندھی میں لکھتا رہا ہے۔ 1955ء سے 2008ء تک یہ سفر جاری وساری ہے اور دعا ہے کہ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ پہلے ان کی ابتدائی زندگی پر نظر ڈالتے ہیں جب وہ ایک اچھے کرکٹر سے ادب کی پیچ پر پہنچا اور قلم کے ایسے چھکے مارے کہ لوگ دیوانہ وار اس کی کہانیوں، کالموں، ڈراموں اور ناولوں کا انتظار کرنے لگے۔ جتنی محبت امر جلیل کو ملی اس کا عشر عشیر بھی کسی دوسرے قلمکار کو نہیں ملا۔ کچھ ہی نام ہیں جن کی کتابیں ہاتھوں ہاتھ بک جاتی ہیں۔ ان میں امر جلیل کا نام بلا شبہ سرِ فہرست ہے۔ ڈان کے کالم انگریزی پڑھنے والوں میں اس قدر مقبول ہوئے کہ لوگ اخبار ملتے ہی سب سے پہلے میگزین کے دوسرے صفحے کو کھولتے تھے جہاں Mystic Notes میں امر جلیل کی اثر انگیز تحریر پڑھنے کو ملتی تھی۔ 2008ء کے ابتدائی مہینوں میں امر جلیل نے اتنا کھل کر لکھا کہ اخبار نے شائع کرنے سے معذرت کر لی اور لوگ بے چین ہو کر ڈھونڈتے رہے۔ پھر چینل ۵ پر ان کی کھری کھری باتیں سننے کو ملنے لگیں۔

قمر شہباز ان کے لڑکپن کے دوست ہیں جو انہیں کرکٹ سے ادب کی دنیا میں لائے۔ ان کے ایک طویل مضمون سے جو ماہوار سہنی کے امر جلیل نمبر میں شائع ہوا تھا کچھ اقتباسات یہاں پیش کرتا ہوں۔ جو پڑھنے والوں کو یقیناً پسند آئیں گے۔

جلیل کو ان کے والد نے نواب شاہ میں پروفیسر احمد سعید خان کے زیرِ سایہ پڑھنے کو بھیجا تھا، جو اس وقت کالج کے پرنسپل ہو کر آئے تھے۔ انسانی کمزوریوں کے باوجود وہ ایک ذہین اور علم دوست شخص تھے۔ انگریزی ادب میں ایم اے ہونے کے ساتھ ساتھ مغربی ادب پر بھی انہیں خاصی دسترس حاصل تھی۔ پڑھانے کا انداز اس قدر سحر انگیز تھا کہ ہم صرف ان کی کلاس اٹینڈ کرتے تھے۔ مسکراتے ہوئے دوستانہ انداز میں ادب کی دنیا میں لے جاتے تھے۔ یونانی دیو

مالائی قصے تو انہیں سارے ازبر تھے۔ پڑھاتے ہوئے کئی ایک افسانوں، اشعار اور ناولوں کا ذکر کر دیتے تھے۔ عام باتوں سے لے کر کارلائل کے فلسفہ تک ہر بات اتنے مربوط طریقے سے سمجھاتے تھے کہ ہم ہمہ تن گوش ہو کر سنتے رہتے تھے۔ آزاد سوچ کے مالک اور نہایت دلیر شخص تھے۔ کرکٹ کا انہیں بے حد شوق تھا جس کے سبب ہم ان کے اور بھی قریب ہو گئے۔ مگر آگے چل کر یہ تعلقات بگڑ گئے اور ہم نے ان کے خلاف احتجاج اور بھوک ہڑتالیں شروع کر دیں نتیجتاً انہیں لاہور تبادلہ کرانا پڑا۔ وہ ایک لمبا قصہ ہے جو میں یہاں دہرانا نہیں چاہتا، یہاں میرا مقصد ان کا شکریہ بجا لانا ہے کہ انہوں نے دنیائے سندھی ادب کو ایک چمک دار ستارہ بخشا جس کی انہوں نے بالواسطہ پرورش کی، اب جن کو ہم امر جلیل کہتے ہیں"۔

جلیل جب کراچی سے آئے تو سیدھا آ کر احمد سعید خان کے ساتھ رہنے لگے۔ کالج بھی نیا نیا کھلا تھا جس کی اپنی بلڈنگ تک نہ تھی۔ خوجا صاحب کے اسکول کی عمارت اور لائبریری استعمال میں لائی گئی اور خوجا صاحب جو حامد علی کلب کے سیکرٹری بھی تھے انہوں نے اس عمارت کا ایک حصہ احمد سعید خان کو رہائش کے لیے دے دیا، یہ الگ بات ہے کہ ان تمام مہربانیوں کے بدلے میں احمد سعید خان نے ان کے اسکول پر ہی اپنا قبضہ جمانا شروع کر دیا تھا۔

حامد علی کلب کا وہ حصہ جس میں احمد سعید خان رہائش پذیر تھے کچھ اس طرح کرکٹ گراؤنڈ کے کنارے پر تعمیر تھا کہ اس کی پچھلی سائیڈ ہم پویلین کے طور پر کھیل دیکھنے اور بیٹھنے کے لئے استعمال کرتے تھے۔ جب جلیل نواب شاہ آئے تو احمد سعید خان نے ان کو اسی عمارت کا ایک حصہ رہائش کے لیے دے دیا۔ احمد سعید خان کو ادب سے گہرا لگاؤ تھا وہ دن رات مطالعہ میں ہی لگے رہتے تھے۔ جلیل کے کمرے اور ان کے کمرے میں صرف ایک دیوار حائل تھی اور درمیان میں ایک دروازہ تھا جو دونوں کمروں کو ملا دیتا تھا۔ اس طرح جلیل کو احمد سعید خان کو مطالعہ کرتے دیکھنے کا اچھا موقع ملا، وہ دن رات پڑھتے رہتے۔ خود جلیل کے الفاظ میں۔

"میں نے اس شخص کو رات رات بھر کتاب میں آنکھیں ڈال کر مطالعہ کرتے دیکھا۔ پڑھنے کے دوران میں کئی دفعہ نوٹ بک میں کچھ اقتباسات بھی لیتے رہتے۔ ان کی میز، کرسی،

بستر، الماری اور بکسے سب کتابوں سے بھرے پڑے تھے۔ پڑھتے پڑھتے آنکھ لگ جاتی اور ہاتھوں میں کتاب ہوتی تھی۔ میں نے وہاں کئی ایک کتب کے نام یاد کیے اور انہیں پڑھنے کا شوق پیدا ہوا۔ سب سے بڑھ کر مجھے پڑھنے کا یہ انداز بڑا بھلا لگا اور شاید یہاں سے ہی مجھے لکھنے پڑھنے کی عادت پڑی۔''

دوسرا شخص جس نے جلیل کو اچھا ادب پڑھنے کی ترغیب دی وہ تھے ایچ ایم خوجا صاحب۔ حالانکہ خود خوجا صاحب کو بھی یہ یاد نہ ہوگا کہ انہوں نے کب اور کہاں یہ بات کی جو جلیل کو بہترین ادب پڑھنے کی طرف راغب کر گئی۔ مجھے وہ واقعہ اچھی طرح یاد ہے۔ ہمیں کرکٹ کا اس قدر جنون تھا کہ ہم صبح سویرے چار بجے کے بعد کرکٹ گراؤنڈ پہنچ جاتے تھے۔ سب سے پہلے Warm up ہونے کے لئے پورے گراؤنڈ کا چکر لگاتے اور دوڑنے میں سب سے آگے جلیل ہوتے پیچھے ہم سب پلیئرز۔ راؤنڈ پورا کرنے کے بعد نیٹ پریکٹس کرتے تھے جو صبح 9 بجے تک چلتی تھی۔ اس کے بعد ہم ناشتہ کرنے جاتے تھے اور پھر آکر میدان میں کرکٹ کھیلتے، دوپہر کے کھانے کے لئے بس چھوٹے سا وقفہ ہی ہوتا تھا اور پھر کھیل شروع۔ پھر شام کو تین بجے کے بعد پریکٹس شروع ہوتی تھی تو مغرب تک جاری رہتی تھی۔ کالج میں بھی ہم سب ناچتے کودتے تھے مگر انگریزی کے علاوہ شاید ہی کوئی اور پیریڈ لیتے تھے۔ باقی تمام وقت کلاسز کے باہر کرکٹ جاری رہتی تھی۔

ایسے ہی ایک موقع پر ایک دفعہ جلیل کی ایک شاٹ سے کلاس کی کھڑکی کا ایک شیشہ ٹوٹ گیا۔ کالج کی بلڈنگ تو اسی اسکول کی ہی ملکیت تھی جسے خوجا صاحب نے دیا تھا، وہ آدھی چاک پر مر مٹنے والے تھے، جب انہیں پتہ چلا کہ کلاس کا ایک شیشہ ٹوٹ گیا ہے تو ہمیں فوراً طلب کیا۔ نہایت برہم ہو کر پوچھنے لگے۔ ''تم لوگوں نے میرا نقصان کر دیا ہے، پیسے بھر دو۔''

ہم نے اپنی گردنیں جھکا لیں۔ جلیل کی طرف دیکھتے ہوئے خوجا صاحب نے کہا ''قاضی عبدالغنی کے بیٹے ہو ناں؟'' ''جی سر''

''تمہارا باپ کتنا شریف آدمی ہے اور تم۔؟'' اور پھر نصیحتوں کی پٹاری کھول دی۔ جس میں ہمیں سدھرنے پر زور تھا۔ پڑھنے کی اہمیت بتائی گئی، لکھنے کی ضرورت کا احساس اجاگر کیا گیا وغیرہ

وغیرہ۔اسی گوشمالی کے دوران خوجا صاحب نے ایک دو ادیبوں کا ذکر کیا جن کی کتب ہمیں پڑھنے کو کہا گیا۔ان میں Hall Caine کا نام ہمارے لیے بالکل نیا تھا۔ بعد میں پتہ پڑا کہ بڑے بڑے ادیب بھی ان کو نہیں جانتے تھے۔خیر ہم نے اسکول کی لائبریری سے ہال کین کی کتب لے کر پڑھنا شروع کر دیں۔جیسے Manixman , Bondman, Prodigal son یہ وہ کتب تھیں جن کی چھاپ آج بھی جلیل کی تحریر پر واضح نظر آتی ہے۔ہال کین نے تو ہم کو بس پاگل کر دیا ہم نے کوشش کر کے دوسری کتب بھی حاصل کر لیں اور آج بھی میرے پاس لائبریری کی کتب پڑی ہوئی ہیں جس کا علم خوجا صاحب کو قطعی نہیں ورنہ وہ ہمیں زندہ نہ چھوڑتے۔شیشے توڑنے کے پیسے تو ہم نے پہلے ہی نہیں ادا کیے جس کا ذکر وہ آج تک کرتے رہتے ہیں اوپر سے یہ کتب!

ہال کین کی آسان جذباتی اور مشکل اسٹائل نے ہمیں بے حد متاثر کیا، خاص طور پر جلیل تو اس رنگ میں رنگ گئے۔اس کے بعد ہیمنگوے، ولیم سیرویاں، ارون شا اور دوسروں کا بھی ان پر بہت اثر ہوا۔ بنیادی طور پر وہ آج بھی ہال کین کا اثر لیے ہوئے ہیں۔اگر میں ایسا کہوں کہ ان کے دل میں اچھا لکھنے کا شوق ہال کین نے ہی پیدا کیا تو غلط نہ ہوگا۔

پھر ''ادا'' رسالہ جو کچھ عرصہ چلنے کے بعد بند ہو گیا۔اس چھوٹے سے میگزین نے سندھی ادب کو کافی اچھے نام دیئے امر جلیل، بردہ سندھی، گل محمد چنہ، نور عباسی، معصوم ہالائی وغیرہ تو یہ ابتدا 1955ء میں ہوئی اور رسالہ بند ہونے کے بعد جلیل 1962ء تک کہیں بھی نظر نہ آئے، جسے ہم خاموشی کا دور کہتے ہیں۔

پرو فائیل۔امر جلیل کے متعلق

Quick facts obout Amar Jaleel

نام	امر جلیل
خاندانی نام	عبدالجلیل قاضی
تاریخ پیدائش	8نومبر1936
مقام	روہڑی سندھ
تعلیم	ایم اے اقتصادیات، ایم اے تاریخ، گریجویٹ پروگرام ایجوکیشن ٹیکنالوجی۔
تجربہ	الیکٹرونکس میڈیا بطور ذریعہ تعلیم
عہدہ	ڈائریکٹر۔انسٹیٹیوٹ آف ایجوکیشن ٹیکنالوجی علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد۔ ڈائریکٹر جنرل پاکستان نیشنل کونسل آف آرٹس، وائس چانسلر علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد۔
تعلیمی ادارے	یونیورسٹی آف کراچی۔،فلوریڈا یونیورسٹی امریکہ، این ایچ کے ٹیلی وژن ٹوکیو، جاپان، یونیورسٹی آف سندھ، سکھوتھائی اوپن یونیورسٹی تھائی لینڈ۔
کتب	15 کتب
کالم	ڈان، نیشن، ہلال پاکستان، خبریں، افیئر اور اب روزنامہ جنگ کراچی
کھیل	کرکٹ کپتان، وکٹ کیپنگ کا ریکارڈ، شاٹ پٹ۔
شادی	1963 میں ہوئی۔(شادی ان کی اپنی پسند سے ہوئی)
اولاد	ایک بیٹی اور پوتی کو گود لیا ہے (اپنی کوئی اولاد نہیں ہے)

انعامات و اعزازات

☆''کونج''رسالہ بمبئی 1962ء ھندسندھ کہانی مقابلہ میں پہلا انعام
☆روح رھاڻ 1965 سے پہلا ادبی انعام : انسٹیٹیوٹ آف سندھالاجی
1967 ادبی انعام
☆''بادل''رسالہ 1976ءعوامی ریکارڈ بطور بہترین افسانہ نویس
☆پاکستان رائیٹرز گلڈ سے کتاب''دل جي دنيا''پر 1969 ادبی انعام
☆پاکستان گلڈ کی طرف جڈھن مان نہ ھوندس 1971 ادبی انعام
☆مہراں آرٹ اکیڈمی کی طرف سے 1972 کا بہترین مکالمہ نویس ایوارڈ
☆گھوگھٹ لاھ کنوار فلم کو پاکستان ٹیلی وژن کی طرف سے
1973 میں اور ڈرامہ''ماں''پر رول آف آنرملا
☆اکھل بھارت سندھی ساھت سبھا کی طرف سے 2006 میں نیشنل ایوارڈ
☆حکومت پاکستان کی طرف سے 2000 میں تمغۂ برائے حسن کارکردگی
☆حکومت سندھ کی طرف سے مسلک رائیٹنگو پر لطیف ایوارڈ 2000ء
☆Shah Latif excellence Awards 2007
☆کراچی یونیورسٹی سے نشانِ فضلیت 2007ء، کراچی یونیورسٹی سے
29 جون 2008 کو گولڈن جوبلی تقریب میں ملے 16 اداروں کی طرف
سے ملے۔ایوارڈز، شیلڈز، پورٹریٹ بوکے، اجرک اور آنرز اور پتہ نہیں کتنے ایوارڈز جو
یہ لینے نہیں گئے اور کئی ان کی راہ تک رہے ہیں۔

مگر وہ شانِ بے نیازی اور کمال لاپرواہی سے ان چیزوں کو گنتی میں نہیں لاتے اور نہ ہی خود کو کبھی بڑا آدمی سمجھا یا جتایا۔۔۔کبھی نہیں، خود کو فقیر ہی کہتے ہیں اور ان کی چال ڈھال بھی ایسی ہی گواہی دیتی ہے۔من کے بادشاہ عجز و انکساری میں فقیر لاطمع۔حال ہی میں رائٹرز گلڈ نے انہیں نقد انعام 2009ء کا اعزاز بھی دیا جس میں اکادمی ادبیات کراچی معاون رہی۔

''میں نے رام کو بن میں بھٹکتے دیکھا ہے، میں ازل کا انتقام ہوں میں سقراط کے ہاتھوں سے زہر کا پیالا چھین کر پی جاؤں گا۔''
''میں گوتم کو گیان دوں گا، میں شاہجہاں کا رقیب ہوں، میں خاک محل بناؤں گا۔۔''
''پتھر کے صنم سے درد کا دان ہی ملتا ہے۔''

لائیو پروگرام

سندھ ٹی وی پر کلاس روم میں ہر جمعرات کو اور KTN پر جمعہ کو فون پر کئے گئے سوالوں کے جوابات دیتے ہیں

مطبوعہ کتب اور فکر فن پر مبنی
کام کی تفصیل

امر جلیل کی شائع شدہ کہانیاں، مضامین، ادبی خطوط، ناول تقاریر اور شاعری کی مکمل فہرست (امر جلیل نمبر سهٹي سے)

ادا، نوابشاه

1۔	اندرا	کہانی	مارچ1962

نئين زندگي، ڪراچي

1۔	وڻيون ۽ وچوڙا	کہانی	اگست1962
2۔	ادبي خط	خط	ستمبر1962
3۔	ادبي خط	خط	ستمبر1962
4۔	ويران دل جي دنيا	کہانی	نومبر1963
5۔	چنڊ چريو ٿو ڳائي	ادب لطیف	مئی1964
6۔	اڄ ته پيار پڇايون	کہانی	جولائی1964
7۔	سياڻن ۾ هڪ يوڪ	کہانی	فروری1965
8۔	دولت، ناموس ۽ هڪ ڪنوارو	کہانی	مئی1965
9۔	اديب ٺيٺ جا ڪجهه راز ۽ رمزون	طنزیہ	جولائی1965
10۔	انسان	ڈرامہ	اکتوبر1965
11۔	سنڌو سجاڳ	کہانی	نومبر1965
12۔	سرحد	کہانی	دسمبر1965

13-	قلفي ۽ چريٽ	کہانی	مارچ1966
14-	خوني رات	کہانی	مئی1966
15-	پٿر ۽ پيار	کہانی	جولائی1966
16-	محبت ،آرزو ۽دل جي دنيا	کہانی	اگست1966
17-	زندگيءَ جي نہ کتندر کهاڻي	کہانی	مارچ1967
18-	منهنجي محبت ۽ مان	کہانی	جون1967
19-	چريٽ ۽ چار ڇوڪريون	کہانی	مارچ1968
20-	پڙلاءُ	کہانی	ستمبر1968
21-	غلام	کہانی	جنوری1970
22-	جرنيل هوشو	مضمون	جون،جولائی1970
23-	تاريخ جو ڪفن	کہانی	جون1971
24-	افساني متعلق ڳالهہ ٻولهہ	انٹرویو	نومبر1971
25-	هڪ دور جو ماتم	کہانی	اپریل1972

روح رهاڻ حيدرآباد

1-	پيا بہ غم آهن	کہانی	اپریل1963
2-	تون ۽ مان	آزادنظم	ستمبر1963
3-	هڪ خط،هڪ افسانو	ادبی خط	فروری1964
4-	انسان	آزادنظم	مارچ1964
5-	اجالو	کہانی	مئی1964
6-	داغ	کہانی	اگست1964
7-	اسان ۽ اسان	تاثر	اکتوبر 1964
8-	برف جو تاج محل	کہانی	دسمبر1964
9-	اروڙ جو مست	کہانی	اپریل1965
10-	مرڻ کان اڳ ،مرڻ کان پوءِ	کہانی	جولائی1965
11-	هن چار ۾	کہانی	نومبر1965
12-	ڌرتيءَ جي ڌوڙ ،آسمان جا تارا	کہانی	اپریل1966
13-	لهندڙ سج،وڏندڙ پاڇا	کہانی	جولائی1966

14	محرم جانوريءَ جو فرار ٿيل سائي	کہانی	اپریل 1967
-15	منهنجي دل موهن جو دڙو	کہانی	اگست 1967
-16	ڏند ڪتا	کہانی	اکتوبر 1967
-17	سياح گائيڊ ۽ ٽرانزسٽر	کہانی	اکتوبر 1967
-18	سچل سرمست Trouble ۾	کہانی	دسمبر 1967
-19	هڪ لاش ۽ راتين جا رولاڪ	کہانی	اپریل 1968

بادل،حيدرآباد

-1	بارنيس اسٽريٽ جو غنڊو	کہانی	اکتوبر 1966
-2	جلاوطن	کہانی	جون 1967
-3	صدين جو سوداءُ	کہانی	ستمبر 1967
-4	انٽرويو	انٹرویو	اکتوبر،نومبر 1967
-5	حياتي وهه وٺو آهي	کہانی	اکتوبر 1969
-6	پل صراط	کہانی	جولائی،اگست 1970

نئين زندگي،جبلپور،انڊيا

-1	ا ڪيون	آزاد نظم	جنوری 1964
-2	نہ منزل نہ ماڳ	آزاد نظم	مارچ 1964
-3	سپنا ۽ سنڪا	کہانی	اپریل 1964
-4	تلاش	آزاد نظم	جولائی 1964
-5	اي زندگي	تاثر	اکتوبر 1964
-6	آڌاد نظم	آزاد نظم	دسمبر 1964
-7	پٽڙ ۽ پيار	کہانی	مارچ 1965

ڪونج،بمبئي

-1	آڌما	ادب لطیف	مئی 1962
-2	سوجهرو	کہانی	جولائی اگست 1962

ماهوار سهڻي امر جليل نمبر

-	چند وسامي ويو	کهاڻي	ستمبر1962
1-	ادبي خط	خط	اکتوبر1962
2-	هولي	کهاڻي	مارچ1963
3-	اج پيار جون ڳالهيون ڪريون	آزادنظم	جون1963
4-	اج پيار پچايون	کهاڻي	مارچ1964
5-	ادبي خط	خط	اپريل1964
6-	داغ	کهاڻي	جولائي1964
7-	ساجن،منهنجو دوست	کهاڻي	اگست1965

ساهت ڌارا،دهلي

1-	جائزو	مضمون	اپريل1965
2-	گناهه	کهاڻي	اپريل1965
3-	دل جي دنيا	کهاڻي	ستمبر،اکتوبر1966

نئين دنيا،بمبئي

1-	جيون هار	آزادنظم	ڊسمبر1963
2-	عظيم عورت	کهاڻي	جنوري،فروري1964
3-	چار نندڙيون کهاڻيون	کهانيان	اکتوبر1964
4-	هن جڳ ۾	کهاڻي	مئي1965
5-	جلا وطن	کهاڻي	نومبر1967

هير،پونا

1-	جلا وطن	کهاڻي	اگست1967

سرهاڻ،بمبئي

1-	توتان بند بدا ٿيو	ادب لطيف	اگست1966

مخزن کراچي يونيورسٽي

1-	سورهي جي شام	آزادنظم	1964
2-	هوشو شيدي	مضمون	1965
3-	سپنن جي سيج	کہانی	1966
4-	پل صراط	کہانی	1970
5-	Those Who live	انگریزی میں کہانی	1970

برسات,ڪراچي

1-	هڪ گهڙيءَ جو موت	کہانی	نومبر1972
2-	نيزي تي الڪيل انصاف جي ساهمي	کہانی	جنوری1973

سو جهرو ,ڪراچي

1-	منهنجو ڏس آسمان ڪان پڇو	کہانی	جنوری1973

هفتيوار آزاد ,ڪراچي

1-	تنهائي	کہانی	15جون1959
2-	ادبي خط	خط	11اپریل1960
3-	ادبي خط	خط	23مئی1960
4-	بورڊ ڪارو آهي	کہانی	20جون1960
5-	ادبي خط	خط	18جون1960
6-	موت جو آواز	تاثر	30جنوری1961
7-	ادبي خط	خط	20مارچ1961
8-	وري ياد آيا	کہانی	27مارچ1961
9-	ادبي خط	خط	17اپریل1961
10-	ادبي خط	خط	12جون1961
11-	ادبي خط	خط	19جون1961
12-	ضمير ستل آهي	کہانی	27نومبر1961
13-	لاش	کہانی	11دسمبر1961

14۔	مان شريف آهيان	کهانی	4جون1962
15۔	مڙدي ڳالهايو	کهانی	25جون1962
16۔	نظر	نظم	2جولائی1962
17۔	کشمکش	کهانی	27,20اگست1962
18۔	آزاد	کهانی	15اکتوبر1962
19۔	نظر	نظم	22اکتوبر1964
20۔	جوڳين جو ڪ اجوڪ	مضمون	18,4مئی1964
21۔	سکر ۾ هڪ سنڌيءَ سان ملاقات	ملاقات	1جون1964

رهبر ڊائجسٽ ،حيدرآباد

1۔	مردا ڳالهائيندا آهن	کهانی	نومبر1968
2۔	چرپٽ ۽ مداري	کهانی	مارچ1968
3۔	چار نندڙيون کهاڻيون	کهانياں	جولائی1968
	عظمت جو ثبوت		
	انصاف جي ڳولا		
	سڌريل ڳوناڻو		
	ڏرتيءَ جو درد		
4۔	اسٽار سرڪس جو جوڪر	کهانی	اکتوبر1968
5۔	گامون سچار جي پٽ جو انترويو	کهانی	دسمبر1969

چوڏس ،حيدرآباد

1۔	لهندڙ سج جي لام	تقرير	اکتوبر1970
2۔	هوشو شيدي جي شام	نظمينٽر	اکتوبر1970

سهڻي،حيدرآباد

1۔	منهنجو دوست منهنجو دشمن	کهانی	مارچ1966
2۔	رڄ	کهانی	جون، جولائی1966

3-	زندگي هڪ ڪن	کہانی	ستمبر، اکتوبر 1966
4-	چريٽ ۽ هڪ نرس	کہانی	نومبر 1966
5-	عشق ۽ انٽرويو	کہانی	دسمبر 1966
6-	راهون جدا جدا	کہانی	اگست 1976
7-	هڪ دل جي اڪيلائي	کہانی	مئی 1968
8-	زندگي ۽ زهر	کہانی	نومبر 1968
9-	نہ ويڄ نہ طبيب	کہانی	مئی 1971
10-	منهنجو پٽ مهدي	کہانی	جون، جولائی 1971
11-	هڪ خطرناڪ سنڌ پرست جي ڳولا	کہانی	اپریل 1972
12-	مان پڄان مان پُران	تقریر	جولائی، اگست 1972
13-	ڪپيل پانهن جو وارث	کہانی	نومبر 1972
14-	هڪ دور جو ماتم	کہانی	دسمبر 1972
15-	سورهيه مرين سوپ ڪي	تقریر	دسمبر 1972
16-	سرد لاش جو سفر	کہانی	جنوری 1973
17-	نانگ (ترجمہ)	کہانی	جنوری 1973
18-	چتي ڪتي جو موت	کہانی	مارچ 1973
19-	ادبي خط	خط	جولائی 1973
20-	رڻ گجيو، راڙو ٿيو	تقریر	اگست 1973
21-	پکي	کہانی	اگست 1973
22-	ساٿو ساٿو ساھ	کہانی	اگست 1973
23-	نہ تون آهين، نہ مان آهيان	کہانی	اگست 1973
24-	انٽرويو	انٹرویو	اگست 1973

سماهي مهراڻ حيدرآباد

1-	عورت	کہانی	پرچہ 1962,2
2-	انڪار بہ آ، اقرار بہ آ	کہانی	پرچہ 1962,3
3-	سج اُڀرڻ کان اڳ	کہانی	پرچہ 1963,2,1
4-	هولي	کہانی	پرچہ 1964,1
5-	بہ چور	کہانی	پرچہ 1964,3,2

6-	اونده ۾ روشني	ٹیلیویژن ڈرامہ	پرچہ 1971,1
7-	درياهہ توتي دانهہ	ریڈیو ڈرامہ	پرچہ 1971,2
8-	متيءَ جا ماٹهو	ٹیلیویژن ڈرامہ	پرچہ 1971,3
9-	پار ۾ پڍا (ترجمہ)	کہانی	پرچہ 1971,4

ریڈیو اور ٹیلیویژن ڈرامے

1-	درياهہ توتي دانهن	ریڈیو ڈرامہ	اگست 1967
2-	سڄڻ سفر هليا	ریڈیو ڈرامہ	مارچ 1968
3-	زخم زندگيءَ جا	ریڈیو ڈرامہ	اپریل 1970
4-	اونداهہ ۾ روشنيءَ	ٹیلیویژن ڈرامہ	جون 1970
5-	متيءَ جا ماٹهو	ٹیلیویژن ڈرامہ	نومبر 1970
6-	هوندا سي حيات	ٹیلیویژن ڈرامہ	مارچ 1972
7-	عيد ٿي ويئي	ٹیلیویژن ڈرامہ	جون 1972
8-	دوزخ	ٹیلیویژن ڈرامہ	اگست 1972
9-	ماءُ	ٹیلیویژن ڈرامہ	دسمبر 1972
10-	فرما نبردار	ٹیلیویژن ڈرامہ	دسمبر 1972

ریلیز شدہ فلموں میں لکھے ہوئے مکالمے

1-	نوري ڄام تماچي	1968
2-	گھونگھٹ لاهہ کنوار	1970
3-	بادل	1972

ماهوار سهڻي

1-	منڙا شال ملن	1972
2-	البيلي	1973

هلال پاکستان روزانہ اخبار ، کراچی

1- تنهنجيون منهنجيون ڳالهيون — شائع شدہ 300 کالم — 5 مئی 1972ء سے 15 جون 1973

امر جلیل کی ایڈیٹ کی ہوئی مخزن

1۔	لاکالیجین	ایس ایم لاکالج کراچی کی سالانہ مخزن	1958
2۔	چاندو کي این جے وی ہائی اسکول کراچی مخزن		1964

امر جلیل کی شائع شدہ کتب

1۔	دل جي دنيا		1969
2۔	جڈھن مان ھوندس		1971
3۔	رچ	پاکٹ سائیز	1972
4۔	ھن ہار ہر	پاکٹ سائیز	1972

متفرق کھانیاں

1۔	جڈھن مان نہ ھوندس	کہانی	مارچ1971
2۔	شکست	کہانی	1971مارچ1971

پھر یہ کہانیاں ڈرامے اور کالم مختلف زبانوں میں تراجم ہو کر چھپتے رہے اور آج بھی چھپ رہے ہیں۔مثال کے طور پر 2006ء کا ایک ہندوستانی پرچہ رچنا میرے سامنے ہے جس کے ٹائٹیل پرانکی (امر جلیل) کی تصویر ہے۔اندر ایک پروفائیل اور کہانی عشق چھپی ہوئی ہے پھر ایک کتابی سلسلہ کرزما جولائی 2005ء کراچی سے شائع ہونے لگا جنہوں نے ایک روایت بنالی کہ ہر پرچے میں امر جلیل کی ایک کہانی ہونی لازم ہے۔جس کے دسمبر 2005ء کے پرچے میں کہانی غفا شائع ہوئی جس کا میں ترجمہ کر کے قارئین کے ذوق ادب کی نذر کر رہا ہوں۔پھر جون 2006ء میں کہانی کینسر، دو اگست 2006ء میں پاگل کتے کی موت ستمبر 2000ء میں مہدی میرا بیٹا اور اکتوبر 2006ء میں عاشق اور شہید واپس ہوتے ہیں نامی کہانیاں شائع ہوتی رہیں وغیرہ وغیرہ۔چونکہ پاکستان میں کوئی کاپی رائٹس نہیں ہوتے اس لئے مختلف پبلشرز بلا اجازت اپنی مرضی سے پائریسی کر کے کہانیاں کہیں کی کہیں شائع کر دیتے ہیں، کتب کی کتب چھپوا لیتے ہیں جو انکے نام کی وجہ سے لاکھوں تعداد میں بکتی ہیں Just Like Hot Cakes۔مثال کے طور پر دو پاکٹ

سائز کتب "رڃ" (سراب) اور "هن چار ۾" (اس جال میں) جنکی قیمت ایک روپیہ رکھی گئی تھی انکی 50,000 ہر ایک یعنی ایک لاکھ کاپیاں بک گئیں۔ اسی طرح ناول "نيٺ گونگي ڳالهايو" (بالآخر گونگا بول پڑا) جسکے حقوق پبلشرز کو 6 مہینے کیلئے دیئے تھے 3 مہینے میں اس کے 6 ایڈیشن نکل گئے جو 5 ہزار ایک ایک کے حساب سے اسکی 30 ہزار کاپیاں 3 مہینے میں بک گئیں اور اب اس کا انگریزی ترجمہ آنے والا ہے۔ تو اس طرح انکے نام کو بیچ کرانکے کتب کی ان گنت پائریٹیڈ ایڈیشن نکل چکی ہیں نکلتی ہیں اور شاید نکلتی رہیں گی۔ انگریزی اخبار ڈان ،نیشن میں لکھے کالم نے بڑی دھوم مچائی۔ آجکل اور چھپے ہوئے کتب کی فہرست کچھ یوں ہیں روزنامہ ''خبریں'' میں اردو کالم جاری ہیں۔

فهرست مطبوعه کتب

1- دل جي دنيا 1970ء اب تک 14 ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔
2- جڏهن مان نه هوندس 1971 کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔
3- موت منهنجي مهمان 1973ء
4- رڃ پاکٹ سائز
5- منهنجو ڏس آسمان کان پڇو
6- نيون وجود
7- تاريخ جو ڪفن
8- سنڌو منهنجي ساهه ۾
9- هن چار ۾ پاکٹ سائز
10- رني ڪوٽ جو خزانو
11- تنهنجيون ،منهنجيون ڳالهيون (جمع کالم کی کتاب)
12- امر کہانیاں منتخب کہانیوں کا پنجابی ترجمہ
13- نيٺ گونگي ڳالهايو- ناول (انگریزی ترجمہ پریس میں)
14- جيجل منهنجي ماءُ 2008,2007
15- Love, longing & Death انگریزی میں لکھی گئی طبع زاد کہانیاں
16- امر جليل جون اوائيلي ڪهاڻيون 2008
17- چنڊ وسامي ويو 2009
18- ادب ۽ سياست 2010

امرجلیل بحیثیت ایک افسانہ نویس

ادب جو زندگی کی جیتی جاگتی تصویر ہوتا ہے، جو زندگی سے اساس لیتا ہے اور زندگی کو احساس کی شدت عطا کرتا ہے۔ادب سے بے بہرہ شخص ایک مکمل شخصیت، جو تمام احساسات سے آشنا ہو، بنانے سے اکثر محروم رہا ہے۔ ارسطو نے کہا تھا کہ شاعری تاریخ سے زیادہ سچی ہوتی ہے اور فلسفیانہ بھی۔کسی فلسفہ حیات سے نا آشنا شخص کسی طرح مکمل شخصیت پروان چڑھا سکتا ہے۔آج کل کے نصاب میں بھی اس کمی کو شدت سے محسوس کیا جاتا ہے جب تعلیم تجارتی بن کر رہ گئی ہے۔تاریخ، فلسفہ، نفسیات اور ادب کے بغیر تعلیم کس طرح فکر انگیز اور با معنی ہوسکتی ہے۔ ہمارے معاشرہ پر چھایا ہوا یہ کھوکھلا پن، سطحی سوچ اور انتشار اس نا مکمل تعلیم کا ہی نتیجہ ہے۔تو ادب انسان کو زندگی کی باریکیوں کو جاننے سمجھنے اور برتنے میں معاونت کرتا ہے۔ اس کسوٹی پر امرجلیل کا تخلیق کیا ہوا ادب اپنی مثال آپ ہے۔آپ کے افسانے نہایت بے مثل اور جاندار ہیں۔

ہمارے معاشرے کے مذہبی تضادات کے متعلق اپنی شہرہ آفاق کہانی ''سرد لاش جو سفر'' میں اپنے ایک کردار سے کہلواتا ہے۔''میں نے کراہت سے کہا طبقے صرف دو ہوتے ہیں کما لو، پسینے والے اور پسنے والے، ہندو یا مسلمان کوئی معنی نہیں رکھتے، کسی نئی طبقے کی نمائندگی نہیں کرتے۔''

سندھ کی سادہ لوح آبادی کو لوٹنے والوں کو کس خوبصورتی سے بیان کر رہے ہیں۔ کہانی ''اروڑ جو مست'' میں کہتے ہیں بیوقوف سندھیوں کو کلہاڑیوں اور بندوقوں

کے بغیر بھی لوٹا جا سکتا ہے ۔ سندھ میں یا رہزن لٹیرا ہونا چاہیے یا کانی کرامتی پیر ، دونوں پیشے برابر ہیں اور دونوں میں ایک جیسی ہی کمائی ہے ۔ جب کہ ڈاکو کو ہمیشہ خوف رہتا ہے مگر پیر صاحب کو عوام کو لوٹنے پر کسی طرح کا کوئی خوف نہیں ہوتا ، سندھ میں پاگلوں کو پیر اور دیوانوں کو پہنچا ہوا کہا جاتا ہے۔

سندھ کو جاگیر داری سماج نے لوٹا ہے ۔ان کی بڑائی کی ایک مثال ہمیں کہانی ''لھندڑ سچ وڈندڑ پاچا'' میں یوں ملتی ہے ۔''تم کو پتہ ہے کس کو لایا ہوں'' پہلوان نے کچھ اور آگے بڑھ کر کہا ''پنجاب کا دانہ لایا ہوں پچھلے مہینے داتا کے دربار پر ناچی تھی تو سارا پنجاب اس کے قدموں میں بچھ گیا تھا ۔مگر پھر بھی پنجابیوں نے اس کی قدر نہیں کی ۔رب کی قسم ہے سائیں! ایسے دانوں کی قدر صرف سندھ میں ہوتی ہے۔''

ان کے رومانوی افسانے نہایت جاندار، پر اثر ار، محو کر دینے والے ہوتے ہیں ۔ غریب اور درمیانہ طبقہ ہی ان کے افسانوں کی اثاث ہے ۔ ان کا فلسفہ محبت بھی Platonic ہے جس کی بنیاد شاہ لطیف کا یہ فلسفہ ہے کہ

تمہیں ڈھونڈوں اور ڈھونڈتا ہی رہوں پر تمہیں کبھی پا نہ سکوں ، کیوں کہ تیرے ملنے سے مبادا مرے اندر کی تڑپ اور پیاس یہ بے قراری کہیں بجھ نہ ہی جائے۔

یا ٹینیسن Tennyson کا یہ فقرہ To have loved and lost یا بالزاک کی یہ فکر جس کا انہوں نے اپنی کہانیوں میں بارہا حوالہ بھی دیا ہے کہ'' زندگی اس کے ساتھ نہیں گذرتی جس سے ہم شادی کرتے ہیں مگر اصل زندگی تو اس کے ساتھ گذرتی ہے جسے ہم چاہتے ہیں ۔'' اور یہی ہمارے معاشرے کا المیہ بھی ہے جس سے ہزاروں جوانیاں پستی رہی ہیں۔ تڑپتی رہتی ہیں اور شاید سسکتی ہی رہیں گی کہ یہی طبقاتی سماج کی دین ہوتا ہے۔ تو امر جلیل رومانیت کے ساتھ ساتھ سماجی حقیقت نگاری بھی بھرپور انداز میں کرتے ہیں ، ان کی رومانیت کا دائرہ نہایت وسیع و عریض ہے ۔عورت یہاں ہمیں مختلف شکلوں

اور علامتوں میں ملتی ہے ۔ کبھی وطن کی علامت سندھو جسے انہوں نے اتنا لکھا کہ لوگ سچ مچ میں انہیں تلاش کرنے لگے کہ سندھو کہاں ہے؟ ایک جیتا جاگتا کردار بنا دیا ۔ اپنے فلسفہ کے تحت وہ لا حاصل محبتوں کے امین ہیں وہ اس عورت سے ابدی محبت کرتے ہیں جدائی جس کا مقدر ہے۔

ایسے سچے عشق میں وہ نہایت گہرے اور جذباتی دکھائی دیتے ہیں ۔ ان کا زبان زد عام فقرہ ان کی کہانی ''هک دل جي اکيلائي '' میں ملتا ہے ۔ کہتے ہیں ''نرگس تم بھول جانے کی بات کرتی ہو ، اگر میں مر جاؤں اور موھن جوڈرو بن جاؤں تو آج سے پانچ ہزار سال بعد بھی میرے وجود سے لوگ تمہاری یادوں کی کھنڈرات کھود کر نکال لیں گے ۔''

اپنے ہی غریب سماج کے معاشی مسائلہ میں الجھی ہوئی جوانیوں کی محبت کی عکاسی کی ہے، انہیں چاہا ہے اور یہ چاہت ہی ان کے معاشی دکھ درد کا مداوا بنتی ہے ۔ اس چاہت نے ایک حوصلہ ایک طاقت بن کر سماج سے ٹکرانے اپنی معیشت کو بدلنے کا عزم اور ولولہ دیا ہے ۔'' نیشنل تھیٹر کے ایک ڈرامے میں بہترین پرفارمنس کا انعام ملا تھا، میک اپ روم آیا تو ڈرامے کی ہیروئن میک اپ صاف کر رہی تھی ۔ مجھے انعام ملنے پر مبارک باد دی ، میں نے اس کا دل رکھتے ہوئے کہا ''فکر نہ کرو اگلی مرتبہ یہ انعام تمہیں ملے گا ۔'' اس نے آئینے کے عکس سے دیکھتے ہوئے کہا ''میں انعام کے لئے نہیں پیٹ پالنے کے لئے ڈراموں میں کام کرتی ہوں'' اس کے جواب میں جو درد تھا غم اور دکھ تھا ، اسے اب تک بھول نہیں پایا ۔ ہیرا کسی کے لئے سنگھار اور کسی کے لئے زہر قاتل ہوتا ہے۔ میں نے راستے کے پتھروں میں تاج محل اور ٹوٹے ہوئے تارے کی بجھتی روشنی میں بے تحاشا چمک دیکھی ہے۔''

ان کے اکثر کردار اپنا تعارف خود کراتے ہیں ان کی حالت زار تنگ دستی ، مجبوری ، معاشی بدحالی اور اس پتھر دنیا کا ظلم وستم ! اس مرتے معاشرے کا آئینہ دار ہوتے ہیں یہ

کردار کہانی ''زندگي هڪ ڪن'' میں لیلا کا کردار'' ایک عورت جس کے خشک بکھرے بال ، آنکھیں اداس ہیں جو دیکھنے میں کمزور لاچار تھکی ٹوٹی ہوئی اور بیمار لگ رہی ہے اس نے آج ایک ناجائز بچے کے جنم دیا ہے۔''

کہانی سوجھرو کی ابتدا کچھ یوں کرتے ہیں'' یہ ان دنوں کی بات ہے جب مفلسی نے ہمیں ماہیِ بے آب کی مانند اپنے جال میں جکڑ لیا تھا اور ہم پر مصیبتوں اور مشکلوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ ابھی نوکری جانے کی فکر جی کو لاحق تھی تو ادھر مشکلوں میں اضافہ کرنے کو جنید کو ٹاءِ فائڈ نے آ گھیرا تھا۔تھوڑا آگے چل کر لکھتے ہیں'' گھر کا سارا سامان میری بے روزگار کی نذر ہو چکا تھا باقی دیوار پر لگا ہوا ایک کلاک بچا تھا جو انسانی دل کی مانند ٹک ٹک کر رہا تھا۔ میں نے سوچا انسان کے دل کی طرح دھڑک رہا ہے یہ ٹک ٹک بھی بند ہو جائے گی تو موت کی طرح خاموش ہو جائے گا۔ مگر اس گھڑی کی موت اور انسان کی موت میں کتنا فرق ہے ! انسان کی تخلیق یہ گھڑی بند ہونے کے بعد چابی سے دوبارہ رواں دواں ہوسکتی ہے ۔دوبارہ زندگی پیدا ہوسکتی ہے مگر انسان کا جسم ٹھنڈا ہونے کے بعد اس میں کون روح پھونک کر زندہ کرسکتا ہے؟''

امر جلیل انسانی زندگی کی شعور کے کامیاب ترجمان کہانی کار ہیں ۔ ان کے سارے کردار سندھی سماج کے نمایاں عکس ہیں اور ان کرداروں کو پڑھنے سے ایسا لگتا ہے جیسے جیتے جاگتے کردار ہمارے سامنے موجود ہیں ۔ ہم ان کی مظلومیت پر ترس کھاتے ہیں ، ان سے پیار کرتے ہیں اور خود کو ان میں پاتے ہیں ۔اکثر یہ سوال ذہن میں پیدا ہوتا ہے کہ خود امر جلیل کس کردار میں ہیں؟ اس بات کا جواب انہوں نے اپنے افسانوں کے پہلے مجموعے ''دل جي دنيا'' کے دوسرے ایڈیشن کے دیباچے میں کچھ یوں دیا ہے۔

میں کون ہوں؟

"دل جي دنيا" کا شاموہوں

پڑاد کا ساجن ہوں

"بارنیس اسٹریٹ جو غنڈو"، کا غنڈہ ہوں

"منھنجو ڈس آسمان کان پچو" کا عبدالرحمٰن ڈکیت ہوں

"تاریخ جو کفن" کا ایاز مکرانی ہوں

''جڈھن مان ھوندس'' میں پھانسی سے پہلے آخری افسانہ لکھنے والا قوم پرست ہوں

میں کون ہوں؟

میں کسی بھی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا ہوں

اصل میں کسی بھی نتیجے پر پہنچنے کا خواہش مند بھی نہیں، تیسری دنیا کے بیچارے ادیب نے یہ جان لیا ہے کہ قلم کسی بھی صورت تلوار سے زیادہ طاقتور نہیں۔

اس کے باوجود تیسری دنیا کا ادیب لکھ رہا ہے اور ادب کی بارگاہ میں اپنے وجود کا نذرانہ پیش کر رہا ہے۔

تو یہ ہیں امر جلیل جو صدیوں سے سکھایا جانے والا مقولہ توڑ رہا ہے کہ قلم تلوار سے زیادہ طاقت ور ہے۔ مگر پھر بھی وہ قلم ہی چلا رہا ہے آج تک کلاشنکوف نہیں چلائی اور اپنی زندگی کا نذرانہ ادب کی بارگاہ میں پیش کر رہا ہے۔ وہ بڑی مشقت سے لکھتے ہیں، راتیں جاگ کر، جسے ہم انگریزی میں Burn mid-night-oil کہتے ہیں۔ آدھی رات کے بعد آپ فون کریں وہ بیدار ملیں گے، کسی کالم کی تراش کرتے ہوں گے۔ انٹرنیٹ یہ کچھ پڑھتے ہوں گے یا کسی کہانی کے کردار سے نبرد آزما ہوں گے۔

امر جلیل معاشرے میں جدید تعلیم اور علوم کے حامل ہیں ان کو معلوم ہے کہ ہمارے مسائل کا حل صرف تعلیم یافتہ معاشرے میں ہے مگر وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ سندھ کے کالج اور یونیورسٹیز کی بڑی بڑی عمارتیں اپنا فرض نبھانے میں ناکام ہو چکی ہیں۔ اس طرح کے خیالات کو کچھ یوں پیش کرتے ہیں۔ کہانی "منھنجي دل موھن جو دڑو" میں لکھتے ہیں۔

''وہ کہتے ہیں کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں کند ذہن کلرک دفتری ڈسپنسر اور استاد پیدا ہوتے ہیں اور ہوتے رہیں گے، میں ان محکوم رعیت کا ایک معمولی اور غیر اہم فرد رہوں گا، میں حاکم نہیں مگر چنگیز خان اور ہلاکو جیسے حاکموں کا شکار بنوں گا۔

منتخب نمائندوں وڈیروں پر بے دھڑک تنقید کی ہے۔ اپنی کہانی "راهون جداجدا" میں لکھتے ہیں۔ ''ووٹ بھی لیتے ہیں عوام سے اور منتخب ہونے کے بعد رعب بھی جھاڑتے ہیں عوام پر۔ سندھی نمائندے غائب تو بہ! ساری رات کریں عیش، عورت شراب۔ صبح کو اجلاس میں اونگھتے رہیں، ارے سندھ کی تو قسمت ہی سوئی ہوئی ہے۔''

ان کی کہانی میں جذبات اور احساسات کو جو زباں ملتی ہے، ظلم دیکھ کر جو احساس کی دنیا میں آندھی اٹھتی ہے اس کو یوں رقم کیا ہے۔ کہانی "دھرتي جي دوڙ آسمان جا تارا" میں لکھتے ہیں۔

'' آخر کار شاہو نیچے کی طرف جھکا اور بچی کو گود میں اٹھا لیا۔ بچی کو ایک بازو سے پکڑ کر، دائیں ہاتھ سے ریوالور نکال کر بچی کے اوپر تان لیا۔ بچی کا منہ اتنا دور بھی نہیں تھا کہ وہ اسے دیکھے ہی نہ پاتا۔ اس نے گھور کے دیکھا اور پھر ریوالور کا سرد لوہا بچی کے منہ میں ڈال دیا۔ بچی سرد لوہے کو چوسنے لگی۔ شاہو کی انگلی ٹریگر پر ساکت ہو گئی۔ آندھی مٹی کے بادل اٹھا کر آسمان کی جانب پرواز کرنے لگی۔ پیپل کے سوکھے ہوئے پتے پرانے گھر کے برآمدے میں تڑپتے ہوئے اڑنے لگے۔'' اور اس طرح ہمارے جذبات کی عکاسی کرتے ہیں۔ امر جلیل کو دلوں کو جیتنے کا ہنر آتا ہے، جذبات کو الفاظ دینا ادیب کا اصلی پیشہ ہے کہ جو میں کہنا چاہتا ہوں مگر کہہ نہیں پا رہا وہ الفاظ سننے کو ہم دنیائے ادب کے متلاشی ہوتے ہیں۔ کہانی "منهنجي دل موهن جو دڙو" عنوان ہی دلی ترجمان ہے، لکھتے ہیں۔

''کہنا چاہا، تاج محل دل ہوتا تو ٹوٹ پڑتا، دیر پا نہ رہتا پر جو کہنا چاہتا تھا کہہ نہ سکا، الفاظ غصے کی آگ میں بھسم ہو گئے'' کہانی "دھرتي جي دوڙ آسمان جا تارا" میں

ایک خانہ بدوش الہڑ کو یوں بیان کرتے ہیں۔

''وہ ایک جنگلی پھول تھیں، جس نے بھی ہاتھ بڑھایا زخمی ہو کر واپس لوٹا وہ آدم سے حوا کا انتقام تھیں۔ صبح سے شام تک ٹوکرے بنا بنا کر جب تھک جاتیں تو اپنے جسم کو آرام دینے کے لئے کروٹیں لیتیں اور جسم کو سانپ کی مانند بل دیتیں تو بھلا کون ہے جو ڈسا نہ جائے۔''

میں تمہارے بغیر زندگی کے صحرا میں اکیلا بھٹکتا ہوا کہیں اندھیروں میں گم ہو جاؤں گا۔ اسی طرح انگریزی میں بھی شدت جذبات سے مغلوب کر دینے والا یہ جملہ سنئے۔

Your eyes are nothing but two twinkling stars that shine in the dark sky!

ادب جو انسان کو دلیل، جواز اور اسباب سے ادراک کرنے کی بڑی قوت بخشتا ہے اور ذہانت کے در وا کرتا ہے۔ امر جلیل نے 1998 میں اپنی کتاب ''دل جي دنيا'' کے دیباچے میں اس بات پر دلیل دی ہے کہ ہم نے جب خدا حافظ کو چھوڑ کر اللہ حافظ کہنا شروع کیا تھا۔

''علم، آگہی اور ادراک انسان کو معاشرے میں تنہا کر دیتا ہے۔ بالکل اکیلا اور وہ آسانی سے خدا کو خیر باد کر کے اللہ حافظ کہہ نہیں پاتا کیونکہ وہ جواز سے دستبردار ہو نہیں سکتا۔

پھر آگے لکھتے ہیں۔

''خدا حافظ کی جگہ اللہ حافظ کہنے سے معاشرے پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ پہلے خریدے ہوئے جھوٹے گواہ عدالتوں میں خدا کی قسم کھا کر جھوٹی گواہیاں دیتے تھے اور بے گناہوں کو عمر قید اور پھانسی کی سزائیں ملتی تھیں اب وہ وہی کام اللہ کے نام پر قسم کھا کر کرتے رہیں گے۔ جن کو بے گناہ مرنا ہے وہ مرتے رہیں گے۔ جن کو اختلاف رائے کی سزا بھگتنی ہے وہ بھگتیں گے۔ خدا حافظ کی جگہ اللہ حافظ کہنے سے ٹیلی ویژن سے نشر ہونے والی خبریں سچی ثابت نہیں ہوں گی۔''

کہانی لکھنے کا ایک انوکھا انداز امر جلیل کا اپنا خاصہ ہے جس میں وہ مکالموں کے ذریعے کلائمیکس تک لے جاتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملوں سے جو نہایت ہی مروج اور آسان زبان میں ہوتے ہیں اپنے کرداروں سے بلوا کر وہ انہیں واضح کر دیتا ہے اور پورے ماحول اور مرکزی

خیال کو بھی اجاگر کر دیتا ہے ۔ کردار نگاری کا جب عروج آتا ہے تو وہ کچھ اس طرح سے اس کا اختتام کر دیتا ہے کہ پڑھنے والا عش عش کر کے اٹھتا ہے کیونکہ یہ انجام تو اس کی سوچ سے بالاتر تھا۔ یہی چونکا دینے والا انجام ہی پڑھنے والوں کو ان کا گرویدہ کر دیتا ہے جسے وہ دیر تک سوچتا رہتا ہے اور روحانی آسودگی پاتا ہے ۔ میں کچھ نام لوں تو ان کی کہانیاں میں جڈھن مان هوندس، "منهنجو پٽ مهدي"، "دل جي دنيا"، "سرد لاش جو سفر" "جڈھن مان نہ هوندس"، "تيون وجود" "تاريخ جو كفن" "منهنجو ڈس آسمان كان پچو" ۔ ان کی کہانیوں کے عنوان ہی اس قدر جاذب نظر اور دل چھونے والے ہوتے ہیں کہ سن کر ہی بندہ ان کی طرف راغب ہونے لگتا ہے، اتنی رومانیت ان کے وجود میں بھی ہے کہ گارشیا مارکیز کی کتاب بن گئے ہیں Hundred years of solitude مجھے ان کے وجود میں دکھائی دیتی ہے۔

مگر کہانیوں میں ان کی رومانیت فراریت والی نہیں وہ بھی ایک خاص مقصد کے لئے ہے جس سے وہ ایک عام تجربے کے کسی زاویے کو اجاگر کرتا ہے اور اسے اپنے مقصد کی طرف لے آتا ہے اس رومانیت میں زندگی کے حقیقی مسائل اور نفسیاتی الجھنیں اس طرح پروان چڑھتی ہیں کہ کہانیاں لازوال حسن کی علامتیں ہو جاتی ہیں۔

امر جلیل کا مشاہدہ اتنا عمیق اور گہرا ہے کہ وہ راستوں پر چلنے والے لوگ، دکانداروں، گاہکوں اور ہاکروں کو تیز نظر سے دیکھ کر ان کی حرکات و سکنات کو الفاظ کے روپ میں کچھ اس طرح پیش کرتا ہے کہ منظر آنکھوں کے سامنے ابھر آتے ہیں۔ ذرا اسے پڑھیے۔

''اسپتال روڈ پر رک کر مشتاق پھر سے کسی رکشا یا ٹیکسی کا انتظار کرنے لگا ۔ انتظار کرتے ہوئے اس کی نگاہیں بے وجہ بھٹکنے لگیں ۔ سامنے کے راستے کے اس پار ایک ریڑھی والا حلوہ پوری بیچ رہا تھا۔ آٹے کے پیڑے ہاتھوں سے تھاپ کر پھیلا دیتا تھا، جب گول ہو جاتے تو ابلتے ہوئے تیل میں ڈال دیتا تھا ۔ پوری فوراً ہی تیل کی سطح پر ابھر

آتی تھی ۔ کڑھائی سے پوری کو کفگیر سے نکال کر چھلنی جیسے تھال میں ڈالتا جاتا تھا ۔ ایک میلا کچیلا لڑکا تھال سے پوریاں نکال کر تھالی میں رکھتا اور ساتھ ہی چھولے آلو کی بھجیا بھی ڈالتا جاتا تھا اور بیٹھے ہوئے گاہکوں کو دیتا جاتا تھا۔(کہانی غلام)

اسی طرح ان کے مکالمے بھی کرداروں کی سچی زبان ہوتے ہیں ۔ جو بولی وہ بولتے ہیں اسی کو انہیں الفاظ میں پیش کردیتے ہیں ۔مثلاً کہانی ''بارنیس اسٹریٹ جو غنڈو'' میں مکرانی کردار کو یوں بلواتا ہے۔

''جانو پاشا، یہ ہیں سائیں غلام حسین سندھ کا آفت وڈیرا'' گھانچی نے تعارف کروایا۔غلام حسین اور میں این جیاء اسکول میں پڑھتے تھے۔''

''اڑے تون پڑیلو آئیں، گھانچی کھانا کھراب'' جانو نے حیرت سے گھانچی کی طرف دیکھا۔ ہاں نہ، ماسٹر کھانا کھراب اشکول نے راشٹکیٹ نہ کیا ہوتا تو ولا میں ماٹک کرا ہوتا۔''

ان کا نقشہ بھی کچھ اس طرح سے کھینچا ہے کہ حلیہ سے وہ ہمارا سامنے کھڑا ہو جاتا ہے۔ جیسے اونٹھ جیسے موٹے ہونٹ، چراغ سی دہنی آنکھیں، بھیڑ جیسے بال، توے جیسا کالا رنگ اور مسلسل پان سے لال منہ میں داغدار دانت وغیرہ وغیرہ۔

اسی طرح اس کے کرداروں کی دنیا بھی بڑی وسیع ہے جن کے احساسات، جذبات ان کے سماجی عہدے حیثیت اور تعلیم کے مطابق موزوں الفاظ میں ادا کرتا ہے۔کلارک استاد، دادا گیر، غنڈے، ڈاکو، افسر، لیکچرار اور سماجی سیاسی رہنما یا مل مالک اور مزدور، کسان، زمیندار، ایم این اے اور انٹرویوز سب کے سب اپنے اصلی روپ، موڈ مزاج اور نشست برخواست میں زندہ نظر آتے ہیں۔

کہانی پل صراط میں رقم طراز ہیں۔

''پل صراط کیا ہوتی ہے بابا؟''

''پل صراط بال سے باریک اور تلوار سے تیز ہوتی ہے اور قیامت کے دن ہی ظاہر ہوتی ہے۔''

میں نے بچوں کو بتایا۔''اس دن سے سورج کا جلتا ہوا گولا دھرتی سے فقط ایک نیزے کی دوری پر ہوتا ہے اور پل صراط کے نیچے سمندر ابلنے لگتا ہے۔'' بچوں کی سانس ہلک میں اٹک گئی۔ کنڈو اپنا منہ پھاڑ کر رونے لگا۔ بابا مجھے ڈر لگتا ہے۔

امر جلیل نے زندگی کو بلا واسطہ بھی دیکھا ہے اور اپنی ذات کے ذریعے بھی پرکھا ہے۔ انہوں نے سماج کی محرومیوں میں تشنگیوں اور ناسوروں کی عکاسی کی ہے۔ یہ محرومیاں صرف غریب اور نادار طبقے کی ہی میراث نہیں، ان سے ہر طبقہ اور صاحب ثروت بھی دوچار ہے۔ ہاں ان کی شکل صورت الگ ہوتی ہے۔ بچھڑنے کا دکھ، نہ پا سکنے اور نہ مل سکنے کی حسرت کچھ کرنے اور کچھ نہ کر سکنے کی مجبوریاں۔ وہ ان تمام دکھوں سے نبرد آزما ہیں ان محرکات کا بھی تجزیہ کرتے ہیں۔ زندگی کی گونا گوں سچائیاں اور ایک دوسرے پر پڑنے والے اثرات سے بھی بخوبی واقف ہیں۔ کثرت میں وحدت دیکھنے کا بھی انہیں علم آتا ہے۔ انسانی رشتوں کے تعلقات باہم کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اور حوادث اور واقعات کی تہہ میں چھپے ہوئے محرکات کو بھی بھانپ لیتے ہیں۔ وہ اپنے بے باک اظہار، ذہانت اور کلمہ حق سے استعمال کئے ہوئے کرداروں کو زندہ جاوید کر دیتے ہیں۔ جیسے ان کی یہ کہانیاں ''ساٹو ساٹو ساھ "هڪ خطرناڪ سنڌ پرست جي ڳولا " "سچل سرمست ٽربل ۾ " وغیرہ وغیرہ ان کرداروں میں سچائی کی بے با کی اور ان میں پیش آنے والے نازک مسئلے کرداروں کے خاص قومی فکر اور جدید معاشرتی الجھنیں ابھر کر پڑھنے والوں کو بے انتہا متاثر کرتی ہیں۔ امر جلیل نے علامتی کہانیاں بھی لکھی ہیں جو نہ صرف اپنا لوہا منوا چکی ہیں مگر متعدد زبانوں میں ان کے تراجم بھی کئے گئے ہیں۔ یہ سندھی کہانی میں ایک نیا فنی رجحان ہے۔ جیسے کہ "پکي"، "ڪپيل ہانھن جو وارث" ، "منھنجو پٽ مهدي"، "چتي ڪتي جو موت"، "سچل سرمست Trouble ۾" ، "جلا وطن" وغیرہ۔ بہت مقبول اور مشہور ہوئیں۔ ان میں دیئے گئے کردار ضرور غیر معمولی دکھائی دیتے ہیں۔ ان کا شعور عمل یا کردار عام آدمیوں سے مختلف دکھائی دیتا ہے۔ یہاں تخلیق کی عظمت اور زبان کی مبالغہ آرائی بھی سامنے

آتی ہے۔ معنی خیز طنز کے نشتر بہت چوٹ دیتے ہیں۔ ذرا پڑھیے۔

ملباریوں کے گاہک اپنی پیشانیوں پر صدیوں کی تاریخ کے آثار لئے پھرتے ہیں۔ ان کے ہونٹوں پر انسانیت کی وہ گمشدہ مسکراہٹ بستی ہے جس کی تلاش میں انسان نے فیس پاؤڈر سے لے کر گن پاؤڈر تک کی ایجادات کر لی ہیں مگر وہ مسکراہٹ کی فیکٹری آج تک نہ لگا سکا ہے۔''

(سچل سرمست Trouble ہر)

کیا طنز ہے! چھوٹے ہوٹل اور فٹ پاتھ پر بسے ہوئے قہوہ خانوں میں آنے والے لوگ اپنے ساتھ صدیوں کے سپنے اور ناکامیوں کے نوٹ لئے گھنٹوں بیٹھے خوش گپیاں کرتے ہیں لیکن ان کے اندر درد کے دریا بہتے ہیں۔ حسرتوں کے چشمے پھوٹتے ہیں اور مایوسیوں کی پھلواریاں نکھرتی ہیں۔ اسی کہانی کا دوسرا ٹکڑا ملاحظہ کریں۔

''سچل نے جب سے ماسٹری چھوڑ کر پکوڑے بیچنے شروع کئے ہیں تب سے وہ خوشحال ہے۔ اب وہ کبھی خودکشی کا خیال بھی دل میں نہیں لاتا۔''

اساتذہ کی کم تنخواہ پر کیا گہری چوٹ کی ہے۔ روح میں اتر جانے والا نشتر یوں چھوڑ دیتا ہے۔ آگے اور پڑھتے ہیں تو مذہب کی کھوکھلی تبلیغ پر یوں وار کرتے ہیں یہ شکم سیر آسودہ مبلغ۔

''جمعہ کے دن مولانا عبدالجبار گپچی مسلسل ڈیڑھ گھنٹے تک خطبے سے پہلے بولتا ہے اور اپنے رشتے داروں کو قبر کے عذاب، قیامت کے خوف اور اللہ سائیں کے قہر سے ڈرانے کی کوشش کرتا ہے، لوگ جو پہلے ہی سے بے روزگاری، بھوک کے عذاب اور خالی دماغ میں بیٹھے ہوئے شیطان کے جبر سے سہمے ہوتے ہیں ان پر مولانا عبدالجبار گپچی کی تقریروں کا زبردست اثر پڑتا ہے۔''

(سچل سرمست Trouble ہر)

آج کل کی بھوک ہڑتال اور سیاسی طالع آزمائیاں کچھ یوں پیش کی ہیں۔

''سنو! میرے کان میں کہتا تھا، جب سب چلے جائیں تو میرے لئے ایک کافی اور چار آنے

کے پکوڑے لے آنا''

''مگر تم تو بھوک ہڑتال پر ہو''

''تم نہیں سمجھتے، تم پگلے ہو۔''

یہ سب لیڈر رہونے کی سیاست ہے۔

(چرپٽ ۽ هڪ نرس)

اپنی غربت کا کچھ یوں بھی مذاق اڑایا جاتا ہے۔

تم کو ایسا پہلوان بکرا لے کے دیتا ہوں جو ریس کے گھوڑے کی طرح دوڑتا ہوا پل صراط پار کر جائے گا۔

یار گدھے گاڑی والے، میں نے آہستہ سے کہا میری تنخواہ تو تقریباً ڈھائی روپے روز بنتی ہے ۔بکرا تو دو ڈھائی روپے کا گھاس کھا جائے گا۔تو پھر میرے بچے کیا کھائیں گے۔

''تیرے بچے بھی گھاس کھائیں گے۔گدھے گاڑی والے نے جواب دیا اور پھر زوردار قہقہے مار کر ہنسنے لگا۔(پل صراط)

اس طرح امر جلیل تلخیوں اور محرومیوں پر ہنستے رلاتے ہیں۔اسی طرح ماہوار رسالے کو کچھ یوں بیان کیا ہے۔

''مجھے صرف ایک رسالے کا پتہ ہے۔جو کاغذ کا نہیں ڈامر کا بنا ہوا ہے۔جس پر اشعار نہیں کتے نظر آتے ہیں۔وہ ہے حیدرآباد کا رسالہ روڈ''۔

کہانی کی بناوٹ، پلاٹ اور کردار نگاری مکمل ادیب کی تخلیق ہوتی ہے۔امر جلیل کی بنیادی ہنرمندی ان کے مکالمے ہیں۔مگر وہ کئی مقامات پر نفسیاتی کیفیت کے مطابق کہانی کو اندرونی تضادات سے ابھارتا ہے۔کہیں مقامی آثار اور منظر نگاری کو بھی کام میں لاتا ہے۔جیسے کہانیاں "خوني رات"، "اروڙ جو مست"، "هن چار ۾"، "ڌرتيءَ جي ڌوڙ ،آسمان جا تارا" اور "زندگي هڪ ڪن" وغیرہ۔جہاں وہ واقع نگاری کی خوبصورتی کو کردار نگاری سے

ملا کر کہانی کو کلائمیکس پر لے جاتا ہے اور کبھی وہ منظر نگاری سے بھی کام لے کر کہانی کو عروج بخشتا ہے۔ وہ کہانی کو فنی اجزا کو ایک ماہر تکنیکی انداز سے ابھار کر، فقط عروج پر لا کر انجام پذیر کرتا ہے کہ پڑھنے والا اسی کے ساتھ ہی محوِ سفر رہتا ہے اور اس سحر انگیز پلاٹ میں مکمل پھنس جاتا ہے اور زبانی کی سادگی شیرینی اور چاشنی کے مزے لوٹتا ہے۔

بلاشبہ امر جلیل پر ہال کین، ہمنگوے، کرشن چندر اور چیخوف کے فن کا گہرا اثر ہے مگر افسانہ نگاری انداز اس کا اپنا ہے۔ ویسے تو جمال ابڑو، نسیم کھرل، حمید سندھی، مہتاب محبوب، غلام نبی مغل، ربانی اور سراج نے بھی اپنے طور پر اچھے تجربے کیے ہیں مگر وہ اس فن میں کوئی مضبوط روایت قائم نہ کر سکے۔ ہاں نسیم کھرل کی دیہی زبان کی اپنی ایک مثال ضرور ہے۔ مگر امر جلیل نے ایک کہنہ مشق قابل فنکار کی حیثیت سے بڑے وسیع تجربات کئے اور اپنی ایک درخشاں مثال قائم کی۔ میں فخر سے کہہ سکتا ہوں کہ ہر لکھنے والے نے ان کی طرح لکھنے کی کوشش کی اور کئی ایک صرف ان کے فن سے متاثر ہو کر دنیائے ادب میں آئے اور اپنی شناخت پیدا کرنے میں کوشاں ہیں۔

کچھ واقعات اور المیات جب وقوع پذیر ہوتے ہیں تو امر جلیل کا حساس دل ان سے اس قدر متاثر ہوتا ہے کہ وہ لکھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ لکھنا ہی ان کا Catharsis ہے اور ان کا ادب تکلیف، درد اور کرب سے ہی جنم لیتا ہے۔ مثلاً الیکشن ہنگاموں سے متاثر ہو کر کہانی **"منهنجو پٽ مهدي"** لکھی۔

کندھ کوٹ کے مذہبی ہنگاموں میں جو شرمناک واقعہ ہوا اس پر لکھی **"سرد لاش جو سفر"** ایک ایس ڈی او نے ایک یورپین سیاح عورت کی جس طرح عصمت دری کی اس پر لکھی کہانی **"هن چار ٻر"**۔ ادیبوں کے پیچھے جن میں ان کا نام سرفہرست ہے۔ جو سی آئی ڈی اور ڈی پی آر کی کارستانیاں کی گئیں ان پر کہانی **"هڪ خطرناڪ سنڌ پرست جي ڳولا"**، لسانی ہنگاموں پر کہانی **"ڪپيل ٻانهن جو وارث"** لکھی۔

سیاست میں مخالفت لیڈر کو مروانے کو موضوع پر لکھی کہانی **"چتي ڪتي جو موت"**۔ اس

طرح وہ پڑھنے والوں کے جذبات کی بھی ترجمانی کرتا رہا، واقعات کو تاریخی دستاویز طور پر محفوظ بھی کرتا رہا کہ کہتے ہیں تاریخ میں صرف نام اور سال ہی سچے ہوتے ہیں جب کہ ادب میں صرف یہی جھوٹ ہوتا ہے باقی سب سچ محفوظ ہوتا ہے۔ تو یہ کہانیاں آج بھی ان واقعات کو آئینے کی طرح سچے عکس میں پیش کرتی ہیں۔ پڑھنے والے اس لئے دیوانہ وار ان کو چاہتے ہیں کہ وہ ان کی توقعات پر پورا اترتا ہے۔ مناسب اور موزوں الفاظ میں ان کے جذبات کو زباں دیتا ہے۔ مصلحت پسندی، منافقت اور چاپلوسی سے کبھی کام نہیں لیتا اور نہ وقت کے آگے جھکا، نہ سلام کیا کیونکہ فقیری سب سے بڑی بادشاہی ہے۔ اور وہ خود کو آج بھی فقیر آدمی کہتے ہیں۔ یہی ان کا سچ ہے۔

ان کی نئی کتاب "جیجل منهنجي ماءَ" جس کے دو ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ بک گئے۔ کچھ چھوٹی کہانیاں مکالموں کے سحر میں اس قدر اثر انگیز ہیں کہ قاری دیر تک اس تاثر پر سوچتا رہتا ہے۔ چینی کی مہنگائی، راشن کی قطار اور بلیک میلنگ جو 70 کی دہائی میں دکھائی ہے وہ آج بھی ویسے ہی موجود ہے۔ پیاز کا مہنگا ہونا، افسران کا رشوت لے کر کام کرنا، ظلم، نا انصافی، استحصال۔ واقعی کچھ بھی تو نہ بدلا ہے پھر اس کی پرانی کہانیاں اور وہ کردار کیونکر نہ مقبول ہوں!

کمیونسٹ شاعر کے عنوان سے سچل سرمست پر ایک جاندار تاثراتی کہانی ہے جو برملا اظہار کرتا ہے کہ مذہبوں نے ملک میں لوگوں کو لڑایا۔ پیروں اور پنڈتوں نے لوگوں کو بے حد بہکایا۔ یہ کتاب اپنی مثال آپ لگی جب ہی مہینوں میں ہزار کا پیاں ہاتھوں ہاتھ بکیں کہ پبلشر کو اس کا دوسرا ایڈیشن فوراً لانا پڑا۔ اسی طرح ان کی انگریزی کتاب Love Longing and Death کی بھی پاکستانی ایڈیشن کی مانگ ہے۔ جس پر آج کل کام ہو رہا ہے۔ امید ہے کہ یہاں کے لوگوں کو با آسانی مہیا ہو سکے گی۔ ایک خاص بات یہ ہے کہ امر جلیل اپنی کتاب کی قیمت ہمیشہ کم رکھنا چاہتے ہیں۔ ان کا اصرار ہے کہ میں عام لوگوں کے لئے لکھتا ہوں تو قیمت بھی ان کے حصول میں ہونی چاہیے۔

امر جلیل بحیثیت ایک کالم نگار

آج کے دور کا مقبول ترین سلسلہ کالم نویسی ہے کہ اخبار ٹی وی چینل نے اس الیکٹرونکس میڈیائی دور میں نئے ہیروز بنا دیئے ہیں۔ امر جلیل نے جو کام 70 کی دہائی سے شروع کیا تھا وہ آج بھی اسی زور وشور سے جاری ہے۔ ویسے بھی وہ پچھلے 53 سال سے مشق قلم سے ہی زندہ ہیں۔ ان کی کارکردگی کو سراہنے کیلئے متعدد بار انہیں انعامات اور اعزازات ملے ہیں۔ ملتے آ رہے ہیں اور ملتے رہیں گے۔ صدارتی ایوارڈ، بیرونی ملک کئی اعزازات پائے اور گولڈن جوبلی فنکشن جہاں اکیڈمی آف لیٹرز کراچی میں بطور خاص شمولیت کی اور جس میں شرکت کرنے جناب افتخار عارف خود اسلام آباد سے تشریف لائے تھے۔ یہ فنکشن امر جلیل کی 50 سالہ گولڈن جوبلی منانے کیلئے ہوٹل ریجنٹ پلازہ میں 29 جون 2008 کو منعقد کیا گیا جس میں وزیر ثقافت ،سندھ یونیورسٹی اور کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلرز اور سندھی، اردو اور انگریزی کے نامور ادیبوں اور شعراء نے شرکت کی۔ اس تقریب کا اہتمام شاہ عبداللطیف بھٹائی چیئر کراچی یونیورسٹی نے محکمہ ثقافت سندھ اور اکادمی ادبیات پاکستان کے تعاون سے کیا تھا۔ یہ ایک یادگار تقریب تھی جس میں مسلسل 5 گھنٹوں تک لوگوں نے بڑے جوش وخروش سے شرکت کی اور جس میں 16 اداروں نے امر جلیل کو انعام وکرام سے نوازا۔

پھر 2009 میں رائٹرز گلڈ نے اکادمی ادبیات کے تعاون سے امر جلیل کو اعزاز دینے کے لئے ایک تقریب منعقد کی جہاں انہیں نقد انعام سے نوازا گیا اور چیدہ چیدہ شخصیات ادب نے ان کے فن اور شخصیت پر روشنی ڈالی۔ قابل ذکر ایک سگھڑ نے اپنے عوامی انداز میں جوان پر اشعار پڑھے

وہ ایک الگ اعزاز تھا جسے عوامی میڈل کہنا چاہیے۔

تو وہ ہر حیثیت میں ایک منفرد قلم کار ہیں جن کا قلم ہی جینے کا سبب ہے اس بے مقصد وجود کو مقصد اور بے معنی حیات کی معنی اور مطلب ہے۔ان کے کالم دراصل کہانیاں ہی ہوتے ہیں کسی بھی زبان میں لکھیں۔جن میں اس دھرتی کا درد، سیاست کے الجھے مسائل اور سماجی برائیوں پر بھرپور وار کیا جاتا ہے۔اپنے کالموں کے پہلے مجموعے "سنڌو منهنجي ساهہ ۾ "اس زمین کو محبوب بنا کر لکھتے ہیں (دیباچہ) میرے ہونے اور وجود کا سبب سندھ ہے۔میری تحریر کا مقصد اور مقصد کو منصب سندھ نے دیا ہے۔میں نے زندگی کے دھوپ چھانوں میں سندھو کو محسوس کیا ہے۔ یہ دیباچہ لکھتے ہوئے میرے پاس سندھو کے تجسس کے جواب میں کہنے کو کچھ نہیں ہے۔میرا وجود، میرا حوالہ، میری پہچان سندھ کے علاوہ بے معنی ہے۔اس نے مجھے زندگی کے صحرا میں کھلتے ہوئے کیکٹس سے پیار کرنا سکھایا اور میرے لئے ممنوع محبتوں کی اصطلاح ایجاد کی اور ممنون محبتوں کے لئے درد کا دستور تحریر کیا ہے۔

اس طرح اس نے ہلال پاکستان اخبار کے لئے دو ہزار کالم لکھے اور اخبار کو زمیں سے اٹھا کر آسمان تک پہنچا دیا۔" بندشوں میں پچھلے بائیس سال سے لکھ رہا ہوں میں بندشوں اور چیلنجز کے سامنے اور زیادہ قوت سے بھرپور جذباتی ردعمل سے لکھ سکتا ہوں۔کوئی کوئی ذہن آتش کدے کی طرح ہوتا ہے۔تیل کے چھینٹے پڑنے سے جو جلتے ہوئے تیل کی مانند بھڑک اٹھتا ہے۔میری بدقسمتی یہ ہے کہ میں عام رواجی حالات میں لکھنے کو آمادہ نہیں ہوتا، اگر عام حالات ملتے تو شاید میں بے معنی سمجھ کر کب کا لکھنا ترک کر چکا ہوتا مگر مجھے ہمیشہ غیر معمولی حالات میسر آئے ہیں۔ڈانٹ ڈپٹ، بندشیں، پابندیاں، گھٹن، گروہ بندی اور انکوائریاں اور کڑی سے کڑی آزمائشی آفتیں۔

1947 سے لے کر آج تک ہمارے معاشرے میں کچھ نہیں بدلا ہے۔تفتیش کے دوران پولیس لاکپ میں لوگ آج بھی مرجاتے ہیں مگر پولیس کے اطلاعات میں وہ خودکشی کر کے مرتے ہیں۔آزاد بند سے خود کو پھانسی دیتے ہیں یا سر دیواروں سے ٹکرا کر مرتے ہیں جس میں نیک دل

اور نیک سیرت پولیس عملے کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔ پولیس مقابلے میں مارے گئے لوگ ہمیشہ ڈکیت ہوتے ہیں مجبور اور بے بس عورتوں کو ننگا کر کے تخلیق آدم اور حوا کی توہین کی جاتی ہے۔ کبھی کندھ کوٹ تو کبھی نواب پور میں۔۔۔ ہر حکومت ہر دلعزیز ہونے کی خوش فہمی میں مبتلا رہتی ہے اور عوام کی مکمل حمایت کی دعویدار ہوتی ہے۔ ہر حکومت ہنگاموں اور دھماکوں میں بیرونی ہاتھ اور مالی امداد کا رونا روتی ہے اور ہنگامے کرنے والے لوگ ہمیشہ مٹھی بھر ہوتے ہیں۔ ہر حکومت کو دور میں پاکستان اپنے نازک ترین دور سے گذرتا ہے اور اس دوران اتحاد پر سب سے زیادہ زور دیا جاتا ہے"۔

امر جلیل کالموں میں چھوٹی کہانیاں لکھتے ہیں۔ سیاسی، سماجی واقعات قلم بند کرتے ہیں اپنے غصے، جنون اور دیوانگی کو لکھ ڈالتے ہیں بغیر کسی پرواہ کے کہ نتیجہ کیا نکلے گا۔ کبھی اخبار بند تو کبھی کالم بند۔ سچ ان کی اکلوتی تلاش ہے۔ حالات سے کبھی وہ سمجھوتا نہ کر سکے اور نہ کر سکتے ہیں۔ 14 سال تک ڈان میں Mystic Notes لکھتے رہے۔ 8 سال تک نیشن میں لکھا اور 4 سال تک کاوش میں لکھتے رہے۔ الفتح، خبریں، افیئر اور کیا نہ کہیں آدھا سچ، تو کہیں سب کچھ لکھ کر پورا سچ پڑھنے کو دیتے رہے۔ آج کل روزنامہ جنگ کراچی میں سب جھوٹ کے عنوان سے رقم طراز ہیں۔ جیسے ارسطو نے کہا تھا کہ ادب میں بس تاریخیں اور نام ہی جھوٹے ہوتے ہیں باقی سب سچ ہوتا ہے اور تاریخ میں اس کے الٹ۔

یہاں میں اردو میں لکھے گئے کالم سب جھوٹ، میں سے ایک کالم کرسی، کے کچھ اقتباس پیش کرتا ہوں۔

کرسی سونے چاندی کی بنی ہوئی نہیں تھی اور عام کرسی جیسی تھی سوائے اس کے کہ اس کی پشت عام کرسیوں سے لمبی تھی مگر وہ کرشماتی کرسی تھی۔

ایک مرتبہ ایک گونگا اس کرسی پر بیٹھا تھا۔ کرسی پر بیٹھتے ہی گونگے نے فر فر بولنا شروع کر دیا تھا۔ ایک مرتبہ ایک ان پڑھ شخص کرسی پر بیٹھنے کے بعد وہ عالموں اور دانشوروں جیسی باتیں کرنے لگا۔

ایک مرتبہ ایک نابینا اس کرسی پر بیٹھا تھا اور سات سمندر پار دیکھنے لگا تھا۔ ایک بہرا اسی کرسی پر بیٹھا لیکن وہ بہرے کا بہرہ ہی رہا تھا۔

اس کرسی میں کچھ باتیں ایسی ہیں جو کسی کی سمجھ میں نہیں آتیں۔ اس کرسی پر بیٹھنے والے عام طور بہرے ہو جاتے ہیں۔ وہ کسی کی نہیں سنتے اگر سن سکتے ہیں تو ''واہ'' کی آواز سن سکتے ہیں ''آہ'' کی نہیں۔۔۔۔

دوسرے کالم میں ''رینا کترینا کیسے بنی'' میں آج کل کی کارلیزنگ، کریڈٹ کارڈز اور ہر قسم کا سامان قسطوں اور قرضوں پر لینے کی سہولت لے کر دکھاوے کے امیروں کی جو بہتات ہے اس پر اپنے طریقے سے وار کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

''میں نے بنکوں سے کئی ایک قرضے اٹھا رکھے ہیں۔ یہ جو دو کمرے والا فلیٹ میرے پاس ہے۔ وہ بھی میں نے بنک قرضے سے خریدا ہے۔ گاڑی بھی بنک قرضے سے خریدی ہے۔ گھر کا فرنیچر بھی قرضے کا ہے۔ ٹیلی ویژن، ریفریجریٹر، کمپیوٹر، ہوم تھیٹر وغیرہ بھی قرضے پر لئے ہیں۔ میرا اوڑھنا، بچھونا، لباس، جوتے، آزار بند، حتی کہ میرے موزے اور انڈویئر بھی قرضے کے ہیں۔ میں تہہ دل سے مشکور رہتا ہوں بنکوں کا۔ ورنہ آج میں بے گھر بے سروسامان ننگ دھڑنگ سڑکوں پر پڑا ہوتا۔ خانماخراب لوگوں سے میرا اٹھنا بیٹھنا ہوتا۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ بنک قرضوں کے بدولت میرا اٹھنا بیٹھنا بلکہ سونا اور فراٹے لینا بھی کھاتے پیتے گھرانوں سے ہے جو بہت کچھ کہا جاتے ہیں، پی جاتے ہیں اور ایک ڈکار لے کر ہضم کر جاتے ہیں۔''

پرانے کالموں کی کتابی صورت میں اشاعت "جیجل منهنجي ماءَ" جس کی ایک مہینے میں ہزار کاپیاں بک گئیں اور دوسرا ایڈیشن میرے ہاتھ میں ہے اس کے کالم مرنا بھی مشکل ہے میں سفارش کلچر اور موت کی مختلف صورتوں پر کچھ یوں لکھتے ہیں۔

''تم مرنا چاہتے ہو!''

''ہاں، میں مرنا چاہتا ہوں۔ دھنے نے اس شخص سے پوچھا ''مگر تم کون ہو اجنبی؟''

''میں ملک الموت کا ایجنٹ ہوں''

''کیا تم کوئی ٹرک ڈرائیور ہو؟''

''نہیں''

''تو کیا تم کسی ہسپتال کے ڈاکٹر ہو یا سرجن؟''

''نہیں''

''سپر ہائی وے ہو؟''

''نہیں''

تو پھر تم ملک الموت کے کس طرح ایجنٹ ہو؟'' دھنے نے اجنبی سے پوچھا۔

''کیا تمہارے پاس ایجنسیوں کا سرٹیفکیٹ ہے؟''

ملک الموت کے ایجنٹ نے جواب دیا۔تمہارا مطلب مرنے سے ہے یا میرا انٹرویو لینے سے؟

دھنے نے جواب دیا۔مرنے سے

ملک الموت کے ایجنٹ نے کہا''یہ کام میرا ہے''

تو پھر مجھے مار دو

مرنا اس قدر آسان نہیں ہے اس کے لئے کاغذی کاروائی کی ضرورت ہے۔

''کس قسم کی کاغذی کاروائی''

''کسی کا رقعہ لائے ہو؟''

''میں تیرا مطلب نہ سمجھا ایجنٹ صاحب''

''میرا مطلب ہے کسی کی سفارش لائے ہو؟''

''کس لئے''

''مرنے کے لئے''

''نہیں''

''مجھے افسوس ہے کہ میں تم کو مار نہ سکوں گا''

دھنا بہت پریشان ہوا، ملک الموت کے ایجنٹ کی منت کی کہا

''مجھے مار دو سائیں''

ملک الموت کے ایجنٹ نے جواب دیا''سفارش کے سوائے تیرا کام نہ ہوگا''

دھنے نے کہا''مگر میں تو مرنا چاہتا ہوں''

ملک الموت کے ایجنٹ نے کہا''پیارے مرنے کے لئے بھی کسی نہ کسی کی سفارش لانی ہوگی پھر تم مر سکو گے''

1973 کے پس منظر میں جب سندھی کتب اور ادیبوں پر بہت مشکل وقت تھا اور انہیں ہر جگہ ہراساں اور پریشان کیا جاتا تھا، کئی سو سندھی کتابوں پر بندش لگائی گئی۔ امر جلیل نے کالم لکھا ''رحیم ہنگورے جیسا مجرم'' پوری جیل میں بھاگ دوڑ مچ گئی کہ سی کلاس میں کوئی خوفناک اور خطرناک قیدی آرہا ہے۔ مجرم ایک دوسرے سے پوچھنے لگے۔

''بہت خون کئے ہوں گے''

''رحیم ہنگورو جس نے دو سو قتل کئے تھے میں سمجھتا ہوں اس نے تین سو قتل کئے ہوں گے۔''

''کئی گاؤں کو جلایا ہوگا۔''

''بچوں کو کلہاڑیوں سے کاٹا ہوگا۔''

''مگر وہ ہے کون؟''

''میں اسے پہچانتا ہوں'' ایک بوڑھے قیدی نے کہا

''وہ سندھی ادیب ہے''

امر جلیل نے 14 سال تک روزنامہ ڈان میں جو Mystic Notes کے نام سے کالم لکھے تھے ان میں صرف سچ اور کڑوا سچ ہی لکھا تھا جو ہم سے برداشت نہیں ہوتا۔ جناب پرویز مشرف پر کی گئی کڑی تنقید ان کے دور حکومت میں شاید اخبار والوں کو بار گراں گذری اور انہوں نے ان کے کالم

دینا بند کر دیا۔ سیاسی سچ وہ سچا گھی ہے جو ہم بنا سپتی کھانے والوں کو شاید ہضم نہیں ہوتا۔ ایک کالم جس کا عنوان ہے The Invisible Window جس کا ہیرو پرش (انسان) کے کمرے میں چند نعرے، ہم سچ کو نعرے بازی بھی کہتے ہیں۔ لکھے ہوئے ہیں۔

تمام لوگ مل کر بھی اگر کالے کو سفید کہنا شروع کر دیں تو وہ کالا نہیں رہتا۔

اگر یہ کفر نہ ہوتا شاید ہر انسان اپنا خدا بنا چکا ہوتا۔

بونوں میں تم بے شک قد اور دکھائی دو گے اور قد اوروں میں بونے۔

ایمان بھی ایک ثقافتی لباس ہے جو ایک گروہ سے دوسرے گروہ میں مختلف پایا جاتا ہے۔ تاریخ میں مذہب کے نام پر جنونیت اور خون ریزی کی گئی ہے اور کی جا رہی ہے۔ اس پر پرش ایک سماجی انقلاب لانا چاہتا ہے۔ اس نے ایک تحریک شروع کی جو انسان کی عظمت بحیثیت ایک فرد کو قائم کر سکے۔ وہ ایک شخص کے اس حق کے لئے لڑتا رہے گا کہ وہ اختلاف کر سکے۔ کوئی سوال کر سکے، کچھ رد کر سکے جو اس کے ضمیر کے آگے صحیح نہیں ہے۔

جب پرش کو کہا جاتا ہے کہ یہاں سے جلا وطن ہو جاؤ کہ یہ ریاستی بھیڑیئے تمہیں چیر پھاڑ نہ دیں تو وہ صاف انکار کرتا ہے۔ نہیں میں یہاں ہی رہوں گا اور اپنے ایک فرد ہونے کے حقوق کے لئے لڑوں گا۔ اور جب وہ آدم کی اولاد کو کٹتے دیکھتا ہے، مرتے دیکھتا ہے اور جلتے دیکھتا ہے تو پتھر کا بت بن جاتا ہے اندھا، گونگا بہرہ!

میں ایک فوسل کی مانند آدم کی موت اور مرنے کا تماشا دیکھ رہا ہوں۔ انسان مارنے اور مارے جانے کیلئے پیدا ہوتا ہے۔ وہ لمبے جوتوں میں دلچسپی رکھتا ہے نہ کہ پیدل چل کر اس حتمی سچ کو پانے میں۔ وہ سر پر لوہی ٹوپلہ رکھ کے بغیر دید دانش کے خود کو محفوظ سمجھنے لگتا ہے۔

آگے چل کر لکھتے ہیں۔ کچھ نہیں بدلا بھائی۔ آدمی اپنے لاعلاج مرض میں آج بھی مبتلا ہے ایک دوسرے کو مار کر اس کی ملکیت کی پر قبضہ کر لے اور پھر اور کرے.....

اسی طرح ایک اور کالم Between Arrival and Departure میں نہایت چونکا دینے

والا سچ لکھا ہے جس میں تقسیم ہند کے المیہ کا وہ پہلو اجاگر کیا ہے جو بھیانک اور دل دہلا دینے والا ہے۔ ویسے یہ کالم اور انگریزی کی کہانیاں ان کی ایک اچھوتی تخلیقی کے طور پر اب نیو دلی کے پبلشرز Promilla & Co نے ان کی کہانی Love Longing and Death کے عنوان سے کتاب شائع کر دی ہیں جو 2008 سے ہندوستان پاکستان اور مغرب میں بیک وقت بک رہی ہے۔ جس کا انتساب وہ بچے ہیں جو سانحہ تقسیم کے وقت بالجبر پیدا کئے گئے تو اس کالم میں جس کا عنوان ہے۔ بٹوین اراوئیل اینڈ ڈپارچر میں ایک پروفیسر ڈاکٹر سدھا مہتانی ہندوستان سے پاکستان آتی ہیں۔ وہ نہایت ہی با اثر اور خوفناک شخص سے ملنا چاہتی ہیں جس کا نام سن کر لوگ کانپ اٹھتے ہیں وہ 12 مئی 2007 کو کراچی پہنچتی ہیں جہاں خون کی ہولی کھیلی جارہی ہے۔ یہ نہ سمجھ میں آنے والی گتھی ہے ایک اسکالر ڈاکٹر ایک پرانے بدنام زمانہ ''جلاد'' سے ملنے آئی ہیں۔ اور اس کے علاوہ ان کا کوئی پاکستان میں مطلب نہیں۔ تو آخر میں جب وہ ان سے ملتی ہیں تو کان میں بڑی کرخت آواز میں کہتی ہیں۔

''الحاج جلال الدین صدیقی مدنی، ایک نیک مسلمان، تمہاری بیٹی ہندو ہے اور اس ہندو ہونے پر اسے فخر ہے۔ یہی تمہاری دائمی سزا ہوگی جو تمہیں موت کے بعد بھی اذیت میں مبتلا رکھے گی کہ میری رگوں میں تمہارا خون ہے۔ ایک نیک مسلمان کا خون مگر میں ہندو ہوں اور ایک کٹر ہندو کی بیاہتا بیوی ہوں۔

اور اسی طرح 14 سال ڈان میں، 8 سال نیشن اخبار اور 4 سال کاوش سندھی میں کالم لکھتے رہے۔ خبریں اردو میں لکھے گئے کالم سندھی خبروں اور سوپ میں ترجمہ کر کے شائع کئے جاتے تھے۔ آج غازی میں اردو انٹرویو کو ترجمہ کر کے افیئر سندھی پندرہ روزہ میں شائع کیا گیا ہے جبکہ افیئر میں وہ خود ریگولر کالم لکھتے ہیں۔ ''گشا'' تو ان کے بے انتہا کالم اس طرح بار بار شائع ہوتے ہیں۔ ترجمہ کئے جاتے ہیں اور کبھی کتابوں کی صورت میں ہم تک پہنچتے ہیں اور پہنچتے رہیں گے۔

امر جلیل بحیثیت ایک ڈرامہ نگار

آج کے الیکٹرونکس اور ملٹی میڈیا دور میں سب سے زیادہ اثر انگیز میڈیا یہ چینلز کی نشریات ہیں جو 24 گھنٹے چلتی رہتی ہیں ۔ یہ لوگوں سے براہ راست گفتگو کرنے ، انہیں اپنے خیالات اور نظریات سے ہم آہنگ کرنے کا ایک اچھوتا انداز ہے، خصوصاً لائیو نشریات ۔ اس کی اہمیت سمجھتے ہوئے امر جلیل صاحب خود تکلیف اٹھا کر دوپہر کو اپنے آرام کا وقت بھی اس کی نذر کر دیتے ہیں اور بلا ناغہ سندھ ٹی وی پر ہی منگل کو 8 بجے شام کلاس روم میں گفتگو کرتے ہیں ۔ پھر KTN پر ہر جمعرات کو شام 7:20 پر ویوز آن لائین میں لائیور پروگرام میں تشریف لاتے ہیں جہاں سامعین اور ناظرین سے براہ راست سوال جواب ہوتے ہیں اور تاریخ ، سماجیات ، معاشیات ، ادب اور اقتصادیات وغیرہ پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں ۔ وہ ایک مکمل کمیٹڈ ادیب کی حیثیت سے اپنی پوری زندگی اور وقت عوام اور دھرتی سے منسلک کرتے ہیں۔

اس طرح ڈرامہ جسے ہم مکالمے اور کردار نگاری سے کہانی بتانے کا عمل کہتے ہیں ۔ نہایت ہی پر اثر اور متاثر کن میڈیم ہے ۔ امر جلیل خود ریڈیو پر پروگرام منیجر کی حیثیت سے کام کر چکے ہیں ۔ میڈیا ان کی فنی زندگی کا اوڑھنا بچھونا ہے جس میں انہوں نے امریکا سے خصوصی تربیت حاصل کی اور علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد سے اپنی خدمات پیش کرتے رہے اور ڈائریکٹر اور وائس چانسلر کے منصب تک پہنچ کر سبکدوش ہوئے ۔ ان کی کہانی کی جان ویسے بھی مکالمے ہی ہوتے ہیں جن سے وہ پڑھنے والوں کو اپنی

پوری گرفت میں لے لیتے ہیں ۔ چاہیں تو ہنسا دیں، کھل کھلا کر پیٹ میں درد پڑنے کی حد تک ، بے تحاشا ہنساتے ہیں اور چاہیں تو رلاتے ہیں ۔ ایسے زہریلے سچ اتنی بے رحم باتوں میں ، سفاکانہ ، ظالم اور جارحانہ انداز میں گھنٹوں کتاب بند کر کے پڑھنے والا اس کیفیت میں غرق رہتا ہے اور اس کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں ایسے شخص کو تو ڈرامہ ہی ہونا چاہیے!

ان کا پہلا ڈرامہ "انسان" تھا جو نیشنل تھیٹر کراچی سے 1963 میں اسٹیج ہوا۔

"درياهه توتي دانهن" ریڈیو کے لئے لکھا گیا ان کا پہلا ڈرامہ تھا جو 1967 میں حیدرآباد ریڈیو اسٹیشن سے سامعین کی نذر کیا گیا۔

"اونداهه ۾ روشنيءَ" پی ٹی وی کراچی سنٹر سے 1970 میں ٹیلی کاسٹ کیا گیا ان کا پہلا ڈرامہ تھا۔ یہ پاکستان ٹیلی ویژن کا پہلا ڈرامہ تھا جو بیک وقت تمام سٹیشنز سے ایک ساتھ دکھایا گیا تھا۔

اور ڈراموں میں

1۔	سڃڻ سفر هليا	ریڈیو سے 1968 میں نشر ہوا
2۔	زخم زندگيءَ جا	ریڈیو ڈرامہ 1970
3۔	ماءُ	ٹی وی ڈرامہ 1972 میں ٹیلی کاسٹ ہوا
4۔	منيءَ جا ماڻهو	ٹی وی ڈرامہ
5۔	هوندا سي حيات	ٹی وی ڈرامہ 1972
6۔	عيد ٿي ويئي	ٹی وی ڈرامہ
7۔	دوزخ	ٹی وی ڈرامہ
8۔	فرما نبردار	ٹی ڈرامہ 1972
9۔	فنکشن	1974

10- عيدمبارڪ 1976

11- ماسي مستاني 1976

12- شڪست ڪان پوء ٹی وی ڈرامہ 1995

13- ڳوليان ڳوليان مَر لهان ٹی وی ڈرامہ 1998

14- منٺئ جا ماٺهو ٹی وی ڈرامہ 1999

اس کے علاوہ امر جلیل نے کچھ سیریل بھی لکھی ہیں جونہایت قابل ذکر ہیں جیسے مسافتیں، زیست، سارنگ، سناٹہ بھنور، دشت قابل ذکر سیریلز ہیں۔

امر جلیل کا ڈرامہ ''ماء'' وہ پہلا ڈرامہ تھا جسے تمام ٹی وی سینٹرز سے دکھانے کا اعزاز حاصل ہے۔

ان کے ڈراموں پر تبصرہ کرتے ہوئے ہدایت کار آخوند لکھتے ہیں۔

''امر جلیل کے دو ڈرامے "اوندھ ۾ روشني" اور "ماءُ" بہت اچھے تھے۔ چبھتے جملے جیسے زہر سے بھرے ہوئے تیر تھے۔ کبھی کبھی جلیل ڈرامے میں کلائمیکس پیدا نہیں کر پاتے یا شعوری طور پر وہ ایسا ہی کرتے ہوں۔''

امر جلیل کے دو ڈرامے "منٺئ جا ماٺهو" اور "دل جي دنيا" پی ٹی وی سے تیرہ قسطوں سے بھی زیادہ چلے۔ ان میں لازوال محبت کا وہ افلاطونی فلسفہ تھا جو ان کا خاصہ ہے کہ لاحاصل محبت ہی زندگی بھر کا اصل حاصل ہے جسے لے کر عاشق جوگ لیتا ہے اور جوگی بن زندگی اس تلاش کے نذر کر دیتا ہے جہاں سے آواز آتی ہے کہ

تمہیں ڈھونڈوں ، ڈھونڈوں اور کبھی نہ پا سکوں

اے سجن مانو میرا سوال کہ تیری محبت میں ہی میرے محبوب کاش مجھے آئے زوال

یہ شاہ عبداللطیف بھٹائی صاحب کی فکر ہے سُر سہنی میں کہتے ہیں کہ قیامت کو بھی اگر محبوب مل جائے تو جلدی مل گیا۔ تا حیات یہ پیاس نہ بجھے، یہ تڑپ ختم نہ ہو اور اس کی تلاش جاری رہے۔ سر حسینی کے دوسرے داستان کے 4 شعر میں کہتے ہیں کہ ''اگر میری روح سے ساجن کی یاد بھول

جائے تو تھر میں تڑپتے ہوئے چیہے کی مانند جلتی ہوئی لُو لگنے سے میں مر جاؤں۔ اس فلسفہ کا حاصل ہی فراق ہے وصال نہیں۔ اسی سُر کے 7ویں شعر میں لکھتے ہیں۔

جو فراق سے ہوتا وہ وصال کر نہیں سکتا
میرے آنگن آ کر میرے محبوب نے مجھے دور کیا

8ویں شعر میں رقم طراز ہیں

فراق آؤ مڑ کر کہ مجھے وصال نے جدا کیا ہے

جو زخم فراق میں رس رہے تھے محبوب نے آ کر مندمل کر دیئے۔

سر حسینی داستان کے شعر میں کہتے ہیں

دکھوں نے دکھایا اندوہ نے آشنا کیا
راہِ محبوب درد نے دکھا کر محبوب ملایا

4 شعر میں لکھتے ہیں

سوسکھوں سے سودا ہو اور جان بھی نذر کر دوں
اگر بدلے میں مجھے سوغات عشق حاصل ہو جائے

9 شعر کا ضرب المثل ہے کہ

دکھ ہی سکھوں کی خوبصورتی ہے ان دکھوں پہ سارے سکھ وار دوں
جن کی بدولت ہی میری محبوب سے ملاقات ہوتی ہے

تو اصل فلسفہ جدائی اور ہجر کو سمجھنے کے بعد ہی امر جلیل کے افسانے ڈرامے، ناول، کالم اور مکالمے سمجھنا سہل ہو جاتا ہے۔ یہ ایک انوکھی فکر محبت ہے جو جدائی سے شروع ہو کر فراق میں غرق ہو جاتی ہے۔ وہ پیاس جسے پانی اور پیاسا کر دیتا ہے۔ ان کی زندگی اور ادب کا حاصل ہے۔ یہ صوفیوں کی معراج ہے کہ تو نہیں تیری یاد، تیرے لئے تڑپ، تیرا ذکر فکر اور وہ مجلس محبوب ہے جہاں بس تیرا ہی حوالہ ہو۔ تیرا آلاپ ہو، تیری آرزو سلامت رہے یہ درد ہجر توانا ہو۔ یہ بچھڑنا بھی

کیا خوب ہوتا ہے جس میں محبوب ہمیشہ ملا رہتا ہے۔ ہر سانس میں اس کی آس ہوتی ہے ہر آہٹ اس کی دید دیکھتی ہے۔ مائے نی میں کنوں آکھا۔ درد وچھوڑے دا حال

اس تاثر کے علاوہ ان کے ڈراموں میں روز مرہ کے مسائل کو بھی موضوع کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ ان کے ڈراموں میں ایک طنزیہ کردار ضرور ہوتا ہے۔ جو مزاحیہ انداز میں سماج کی برائیوں پر تنقید کرتا ہے۔ "منهنجا ماڻهو"، میں ڈم ڈم ڈبو ایسا ہی کردار ہے یا یہ فقرہ:

''کیا میں ایک سچ بولوں''

خود ایک گہری چوٹ بن کر ابھرتا ہے۔ امر جلیل نے مروج حالات پر بھی سخت تنقید کی ہے۔

امر جلیل ڈرامے اردو میں لکھے یا سندھی میں ان کا موضوع اس دھرتی کے دکھ ہی ہوتا ہے۔ مٹی سے محبت کو اجاگر کرنا ہی ان کا اثاثہ ہے۔ سماجی مسائل، کاروکاری سودے میں رشتہ (سڱ چٽي) وٹہ سٹہ، ڈاکو، اغواء، قتل و غارت، دہشت اور آج کل کے خود کش بم حملے ان کے ہی موضوع ہیں۔ ٹی وی ٹاک میں بھی کھل کر دوٹوک بات کرتے ہیں اور ڈراموں میں بھی بے لاگ مکالمے سننے کو دیکھنے کو ملتے ہیں۔ انہوں نے سندھی قوم کے روحانی، تہذیبی، ثقافتی اور قومی جذبوں کو ابھارنے اور سندھی زبان سے بے لوث محبت کرنے اور مٹی سے جذباتی لگاؤ رکھنے کی ہی ترجمانی کی ہے۔ ان کا ڈرامہ "شکست کان پوء" میں وہ ایک فرسودہ رسم پر وار کرتے ہیں جس میں وڈیرا عورت سے ہمیشہ شادی نہ کرنے کا حق بخشواتا ہے۔ ڈرامے میں ہیرو اس جاگیرداری نظام سے ٹکراتا ہے لیکن وہ شکست کھا جاتا ہے۔ جیسے کہ زندگی میں ہوتا آیا ہے۔ امر جلیل کے ڈرامے، ان کی کہانیوں کی طرح، اپنی مثال آپ ہوتے ہیں جن پر اس امر محبت کا رنگ چڑھا ہوتا ہے لا حاصل جس کی معراج ہے۔ جہاں محبت عبادت اور پوجا بن جاتی ہے۔ جسے سمجھانے کی میں نے حقیر کوشش کی ہے۔

بھگت کبیر کو مالک نے آکر جنت بسانے کو کہا تو آپ نے ایک دوہا لکھا

کیا کروں تیری جنت کو جہاں سادھ سنگت نہ ہوئے

یعنی مجھے وہ جنت نہیں چاہیے جہاں تیرے چاہنے والے تیرا ذکر نہ کرتے ہوں ۔
حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ جنت میں تو نفس کی تشفی ہوتی ہے (کہ جو چاہو مکمل مل جاتا ہے)
مگر ذکر مجلس میں روح کی تسکین کا سامان ہوتا ہے ۔تو جدائی اور فاصلہ پیاروں کو اور قریب
کر دیتا ہے ۔ امر جلیل کہتے ہیں میں جسے بے حد چاہتا ہوں اس سے ملنا چھوڑ دیتا ہوں ۔
تو وہی رنگ ہے ان کے افسانوں کالموں اور ڈراموں میں بھی۔

امر جلیل بحیثیت ایک ناول نویس

ایک سچا ادیب اپنے دور کا سچا ترجمان ہوتا ہے۔امر جلیل نے تو ایک دور کی تاریخ رقم کر دی ہے۔ان کی تمام کہانیاں، کالم اور ایک ناول وہ تاریخی دستاویزات ہیں جو اپنے اپنے سن، ماہ و سال کے چشم دید گواہ ہیں۔جیسے "هن جار ۾"، "منهنجو پٽ مهدي"، "ڪپيل ٻانهن جو وارث"، "سرد لاش جو سفر"، "پچل سرمست وغیرہ۔اس طرح 1994 میں لکھی گئی ان کی یہ ناول "نيٺ گونگي ڳالهايو" اپنے دور کی تاریخی دستاویز ہے کہ کیسے اور کس طرح سیاسی ہتھکنڈے استعمال کر کے سندھیوں کے خلاف سازشیں کی گئیں۔اسلام آباد کے شہر میں سندھیوں کا کوئی پرسان حال نہیں ملتا۔پروپیگنڈا مشینری سے ہٹلری انداز بیان کر کے کہتے ہیں کہ جھوٹ کو اتنی دفعہ سچ کہو، پھر دہراؤ اور دہراؤ کہ وہ سچ ہی لگنے لگے گا۔اس طرح اس ناول کے کردار گلاب گونگی اور جوگی کو جو سندھ سے اسلام آباد آتے ہیں۔دہشت گرد اور ہندوستانی ایجنٹ قرار دے کر اخبارات میں ان کے خلاف وہ نفرتیں پھیلائی گئی ہیں کہ وہ خود ان کے عزیز اقربا بھی ان کی سچائی پر شک کرنے لگتے ہیں۔حالانکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ان کا سیاست سے تو دور کا بھی واسطہ نہیں نہ ہی انہیں ملکی سیاست کو کوئی علم ہی ہے وہ اسلام آباد صرف گھومنے کی غرض سے اپنے رشتہ داروں کے پاس آتے ہیں مگر سرکاری گماشتے انہیں کیا سے کیا بنا دیتے ہیں۔اس بات کو ان کے ایک پراثر مکالمے سے پیش کروں گا کہ

''ہماری پوری زندگی تو نہ کردہ جرم اور گناہوں کے بے گناہی ثابت کرنے میں ہی گذر جاتی ہے۔''

اپنے مخصوص انداز اور اسٹائل طرز تحریر سے یہ ناول بھی نہایت پر کشش اور ایک ہی نشست میں پورا کرنے کا کمال رکھتا ہے۔ ایک دفعہ شروع کرنے کے بعد اس طرح پڑھتے رہنے اور آخر تک جاری رکھنے کو جی چاہتا ہے۔ عام زندگی، جیتی جاگتی اپنی پوری روانی سے چلتی دکھائی دیتی ہے۔ اپنے مخصوص انداز سے امر جلیل نے صفحات میں جیسے جان ڈال دی ہو۔ مکالمے حسب معمول اس کی روح ہیں اور کتاب نہایت ہی دلچسپ و دل آویز۔

امر جلیل نے اس ناول میں اپنا پورا مشاہدہ، تجربہ اور تخلیقی قوت صرف کی ہے۔ یہ بہترین ناولوں کی صف میں بجا طور پر رکھنے کے قابل ہے جس میں سیاسی معاملات اور سماجی مسائل کی پوری نشاندہی کی گئی ہے۔ افغانستان میں روسی افواج کی مداخلت اور سندھ میں بچھائی گئی سیاسی بساط کہ کسی طور پر سندھ کو ملکی اور غیر ملکی سازشوں کا شکار کیا جائے۔ اس میں اپنے بھی برابر کے شریک ہیں۔ جیسے مراد ٹھاٹھارے کا کردار جو اپنی نوکری کی خاطر اپنی ہی قوم اور دھرتی کے خلاف وہ سب کچھ کرنے کو تیار ہے جس سے اس کی نمک حلالی آقاؤں پر ثابت ہو سکے۔ یہ لوگ مکمل منافقی کا کردار ادا کرتے ہیں اور ہر وقت دل جمعی سے اس عمل میں لگے رہتے ہیں۔ کچھ یوں نقشہ کھینچا گیا ہے۔

اس کی ذہانت بے انتہا تھی کہ گھر کے جس کمرے میں ذوالفقار علی بھٹو کی تصویر آویزاں تھی اسی کمرے میں جنرل ضیاء الحق کے کارندے آکر اس سے سندھ کی معلومات لیتے تھے۔ اس کردار کی حقیقی تصویر ہمیں نظر آجاتی ہے۔ اپنے معاشرے میں سانس لیتے ہوئے لوگ یہی سیڑھی چڑھ کر اوپر پہنچتے ہیں۔ کہ کس طرح مسٹر مراد ٹھاٹھرا کیسے کیسے حربے استعمال کر کے نوکری پکی کرتا ہے اور کلرکی سے افسری پاتا ہے۔ لکھتے ہیں۔

''مجھے مراد ٹھاٹھارے کی رویے پر کوئی تعجب نہ ہوا۔ وہ بہت محنت کر رہے تھے۔ اسلام آباد جیسے نامراد شہر میں قدم جمانے کے لئے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ سندھ میں بے روزگاری کے ہاتھوں مجبور ہو کر اسلام آباد آئے تھے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے سیڑھیاں چڑھتا گیا۔ شکار پور کا اچار، مٹھائی

اور روہڑی خیر پور کے کھجور، شہد کی بوتلیں بانٹتا گیا۔ افسروں کو کھلا کھلا کران کی عقل ماردی، ہر کوئی اسے سر پر چڑھاتا گیا اور وہ ترقی کرتا گیا۔ سندھ کے متعلق معلومات پانے کے لئے مراد ٹھاٹھارے کو اتھارٹی سمجھا جانے لگا۔''

اس دور کا سماجی اور سیاسی ماحول ہمیں زندہ جاوید نظر آتا ہے۔ یہ ناول بے نظیر بھٹو کے 1988 دور حکومت کی خوب عکاسی کرتا ہے جب سندھ کو دہشت گرد ثابت کرنے کے لئے ہماری ایجنسیاں ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ گئی تھیں۔ افغان مہاجرین کا سندھیوں میں اسلحہ فروخت کرنا جس سے سندھ میں اغوا اور ڈکیتی کا بازار گرم ہو گیا۔

دوسری اہم بات جو ناول کے آغاز سے دل کو کھٹکتی ہے اور پڑھنے والے کو اپنا گرویدہ بناتی ہے وہ اسلام کے نام کا کثرت سے استعمال اور حقیقت یہ ہے کہ اسلام آباد میں ایک متوسط آدمی کو اسلام نام کی کوئی خاص جھلک دکھائی نہیں دیتی۔ پھر جو بات دل کی ترجمانی کرتی ہے وہ ناول میں دکھائے گئے وہ ہتھکنڈے اور پولیس کی بنائی ہوئی من گھڑت کہانیاں جس سے معصوم اور لاچار غریب سندھیوں کو اشتہاری مجرم دکھایا گیا ہے۔ لکھتے ہیں۔ ''اسلام آباد میں گم ہوئے اسلام کو ڈھونڈنے کیلئے میں نے سالوں مہینوں اور کئی دنوں کی مشقت کی ہے۔ مگر میں اسے ڈھونڈ نہ سکا ہوں۔ تم اسے کیسے ڈھونڈ لوگے۔'' دوسری جگہ اسلحہ پر لکھتے ہیں۔

''اس نے کہا "چارڈ" نے اپنے تئیں بھرپور کوشش کی مگر وہ دس بارہ کلاشنکوف سے زیادہ بیچ نہ سکا۔ میں چونک اٹھا کہا "چارڈ" واقعی ہتھیاروں کی سمگلنگ کرتا تھا۔

اس طرح ان کرداروں کے بے پردہ کرنے کے لئے امر جلیل نے اپنے کرداروں کا بھرپور استعمال کیا ہے کہ کس طرح پورے ملک کے سامنے سندھیوں کو غدار اور دہشت گرد ڈاکو بنا کر دکھایا گیا ہے جو کہ حقیقت کے قطعی برعکس ہے۔ جس سے خود سندھیوں میں احساس کمتری پیدا ہوتی ہے ۔شالی کا دوست ایک باب میں اس کو اس طرح کہتا ہے۔ یہ سب کچھ میری ڈیوٹی میں شامل تھا کہ تم دہشت گرد ہو۔ تم ملک اور ملت کے دشمن ہو۔ تم نے نظریہ پاکستان کو اب تک دل سے قبول نہیں

کیا۔

تو یہ تاثر بالکل عام ہے جس سے لاکھوں بے گناہ سندھی کئی مصیبتوں کا شکار ہوئے ہیں یہ سب ان صفحوں پر لکھ کر امر جلیل نے لاکھوں کے دل موہ لئے ہیں اور یہی ہوتا بھی آیا ہے ہر دور حکومت میں وہ سول ہو یا فوجی۔ لکھتے ہیں۔

''ہر سیاسی حکومت کے پاس ایک ہی حکمت کا نسخہ ہے کہ سندھی ڈاکو ہیں، غدار ہیں اور ہندوستان کے ایجنٹ ہیں۔''

اس طرح وہ انسانی نفسیات پر بھرپور گرفت رکھتا ہے مجھے یہ گرفت، شیکسپئر میں ہی دکھائی دی ہے جو اپنے ڈراموں میں ہمارے دل کی بات سنا دیتا ہے۔ میرے ذہن میں یہ بات شاید اس لئے بھی آتی ہے کہ امر جلیل بھی مکالموں کی صورت ہی اپنے کرداروں کے احساسات، جذبات اور نشستہ و برخواست کے طور طریقوں سے ہمیں آشکار کرتا ہے۔

اور ہر کردار اپنی اپنی معیاری زبان ہی بولتا دکھائی دیتا ہے۔ وہ کلرک ہو یا افسر، ماسٹر ہو یا لیڈر، مزدور ہو یا کارخانے دار وغیرہ وغیرہ۔ کچھ مکالمے مندرجہ ذیل ہیں۔

''جب آگ لگتی ہے، تو سوکھے اور ہرے سب کچھ راکھ کا ڈھیر بن جاتے ہیں۔''

''جنگ بھی انسانوں کے جنگل میں لگی ہوئی وہ آگ ہے جس میں جو جنگ میں شامل ہوتے ہیں ان کے ساتھ ساتھ جو جنگ میں شامل نہیں ہوتے وہ بھی جل کر خاکستر ہو جاتے ہیں۔''

''یہ دنیا جھوٹ مکر و فریب کے سینگوں پر کھڑی ہے۔ یہاں ہم جیسے مولائی اور بیوقوف لوگوں کے لئے زندہ رہنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں ہے۔''

''اس فتنہ و فریب کی دنیا میں ہم عشق کے علم لئے گھومتے ہیں اور عشق کی صلیبوں پر ہی دم توڑ دیتے ہیں۔''

''جب صحافت کی سچائی آنکھیں بند کر کے حکومت وقت کا ساتھ دیتی ہے تب پیڑ چھاؤں دینا چھوڑ دیتے ہیں اور دریاؤں کے میٹھے پانی میں سمندر گھس آتا ہے اور میٹھے پانی کو نمکین بنا دیتا ہے''

تو اس ناول کا اسلوب اور طرز تحریر ہمیشہ کی طرح طنز و مزاح سے بھرپور اور دل آویز ہے جو اس کے کامیابی کی دلیل ہے اور جو ہاتھوں ہاتھوں بکا ہے۔ ہزاروں کی ریکارڈ بکری اور دو ایڈیشنوں کا بالکل ختم ہو جانا کہ مانگے نہیں ملتا۔ دیہاتیوں کو اپنے سامان کی پوٹلی میں امر جلیل کی کتب باندھتے دیکھا۔ محبوب کو تحفے میں ان کی کتاب بھیجتے دیکھا۔ اپنی محبت کا اظہار کرنے کے لئے عاشقوں کو امر جلیل کے مکالمے مستعار لیتے دیکھا۔ یہ ایک شاہکار ناول کی حیثیت لے چکا ہے جس میں عام آدمی کے دل کی آواز سنائی دیتی ہے۔ کچھ علامتیں کچھ اصطلاح، کہاوتیں اور ضرب المثل بھی عام ہیں۔

اپنے طنز و مزاح سے جو شگفتگی اور طرب انگیز ماحول امر جلیل نے اس ناول میں پیدا کیا ہے وہ انہی کا خاصہ ہے کہ موقع کی مناسبت سے طنز کا استعمال کرتے ہیں۔ آج کا دور جو سیاسی اور ذہنی کشمکش کے تصادم کا دور ہے اور یہی دور طنز و مزاح کے لئے بالکل سازگار فضا مہیا کرتا ہے۔ امر جلیل کی مزاح میں جو شیرینی ہے وہ ہمیشہ برقرار رہتی ہے اور کبھی بھی اعتدال سے باہر نہیں ہوتی۔ وہ ہنسا ہنسا کے رلا دیتے ہیں اور تلخی بھی شیرینی بن جاتی ہے تو کبھی درد دل کی سرحدوں کو پھلانگنے لگتا ہے۔

ان کا یہ ناول نہایت با مقصد، مکمل اور کامیاب ہے۔ ان کا حساس دل انسانوں پر جبر تشدد دیکھ نہیں پاتا اور قلم کی نوک سے وہ ہمارے سینے میں اتار دیتے ہیں اور ہم یہ میٹھا درد لینے کو ہمیشہ بے تاب ہی رہتے ہیں۔ ان کے ایک مکالمے پر ہی اختتام کروں گا کہ

''اس صدی میں خاموشی تدبر کی نشانی ہے۔ یہ صدی بکواس اور بکواس کرنے والوں کی صدی ہے۔ اس صدی میں خاموش رہنے والے سولی کا سنگھار ہیں۔''

اس طرح امر جلیل خود اس زمین پر رہنے والوں کے لئے ایک ''ماں'' ہیں جس کے لئے وہ اس ناول میں کچھ یوں رقم کرتے ہیں جو مجھے ان کی ذات میں محسوس ہوتا ہے۔

''اس کے لہجے میں مجھے ماں کی ممتا محسوس ہوئی۔ زندگی میں کبھی کبھی ہمیں کوئی ایسی ہستی مل جاتی ہے جس کے وجود میں ایک سے زیادہ علامتیں محسوس ہوتی ہیں۔''

امر جلیل نے کچھ فلموں کے لئے مکالمے بھی لکھے ھیں

فلم انڈسٹری بڑی رنگین اور سفاک دنیا ہے۔ جہاں راتیں جاگتی ہیں، بڑی محنت اور مشقت کا کام ہے بدلے میں بے انتہا شہرت اور دولت بھی مل جاتی ہے۔ امر جلیل جیسے فقیر منش ان کو ملے! اپنی عادت کے مطابق مکالمے لکھنے کی حامی بھر لی اور اس چکا چوند کر دینے والی روشن دنیا کو آبسایا (جس کے پیچھے گھٹا ٹوپ اندھیرا ہوتا ہے) آپ نے بڑی تندہی اور مشقت سے فلموں کیلئے مکالمے لکھے اور کچھ ہیروین کو سندھی لہجہ اور انداز بھی سکھایا جو سندھی نہ بول سکتی تھیں۔ بڑی جانفشانی کے بعد یہ مکالمے مکمل ہوئے۔ فلمیں بھی ریلیز ہو گئیں۔ مگر Payment ندارد! جناب اگلے مہینے انشاءاللہ ادائیگی ہو جائے گی۔

امر جلیل نہایت پر تکلف اور حضور شرم شخص ہیں۔ مانگ نہیں سکتے۔ نہ لڑ سکتے تھے۔ نہ جھگڑ سکتے ہیں۔ پیسوں کے لئے تو بالکل نہیں۔ تو ڈائریکٹر، پروڈیوسر آتے رہے وعدے کرتے رہے مگر وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہو جائے۔ خیر فلمیں چلیں اور ان کے مکالمے زبان زد عام ہوئے۔ انہیں اس طرح ہی پسند کیا گیا جیسے ان کی کہانیوں کو۔ یکے بعد دیگرے کل 5 فلموں کے مکالمے لکھے جن کے نام مندرجہ ذیل ہیں۔

نوري جام تماچي

گھونگھٹ لاھ ڪنوار

بادل

مٹڑا شال ملن

البيلي

امر جلیل کی شاعری

بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ امر جلیل ایک شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ بہت اچھا گاتے بھی ہیں۔ ان کے پاس کلاسیکی موسیقی کا ایک بڑا زخیرہ ہے جس سے ان کو گہرا لگاؤ ہے، وہ کلاسیکی موسیقی سن کر ہی لکھتے ہیں۔ ان کے اندر کی تنہائیوں میں ایک موسیقی ہی انہیں سہارا دے سکتی ہے۔ وہ اپنی انوکھی شخصیت کو موسیقی سے محظوظ کر پاتے ہیں۔ جو لوگ گہرا پیار کرتے ہیں ان کا علاج صرف اور صرف موسیقی ہی ہوتی ہے کیونکہ روح کی غذا یہی ہے۔ جو لوگ صرف جسم کی غذا کا خیال رکھتے ہیں اور روح کو نظر انداز کر دیتے ہیں وہ کبھی مکمل شخصیت کے مالک نہیں ہو سکتے نہ ہی کبھی گہرا سکون پا سکتے ہیں۔ ادھوری شخصیت والے ادھورے ہی ہوتے ہیں جنہیں ایک انجانی بے چینی پکڑ لیتی ہے۔ امر جلیل نے شروع میں شاعری بھی کی ہے جس کی فہرست مندرجہ ذیل ہے۔ جو زیادہ تر 1963ء اور 64 کے طوفانی سالوں میں رقم کی گئی۔

نظمیں

1۔ نظم نظم ہفتہ وار آزاد کراچی 2 جولائی 1962ء

2۔ نظم نظم ہفتہ وار آزاد کراچی 22 اکتوبر 1962ء

3۔ آزاد نظم اج پیار جون ڳالھیون کریون۔ کونج۔ بمبئی جون 1963

4۔ آزاد نظم تون ۽ مان۔ روح رھاڻ دسمبر 1963

5۔ آزاد نظم جیون ھار۔ نئین دنیا، بمبئي، دسمبر 1963

6۔ آزاد نظر ا کیون۔ نئین زندگي،جبلپور،اندیا جنوری1964

7۔ آزاد نظر انسان۔ روح رھان،حیدرآباد مارچ1964

8۔ آزاد نظر نہ منزل نہ ماہگ۔ نئین زندگي،جبلپور،اندیا مارچ1966

9۔ آزادنظم تلاش نئین زندگي، جبلپور،اندیا جولائی1964

10۔ نظمیہ نثر ھوشو شیدي جي شام چوڈس،حیدرآباد اکتوبر1970

امر جلیل کے منتخب اشعار کا ترجمہ

تلاش

ڈھونڈا تمہیں
آنکھیں بچھائیں ترسا تیرے لیے
مگر تم کو نہ پا سکا
میری زباں گنگ ہوئی
سنگیت چپ ہو گیا
دل کے ارماں دل میں تڑپتے رہے
یہ کسک کس کو کہیں، کس کو بتائیں
کیسے سنائیں من کی پریت
راہ کٹھن ہے
چار سو اندھیرا
گھائل گھائل تن ہے میرا
کاک[1] کی کیسی ریت
ہائے من کی پریت!

[1] موتی کی بنائی ہوئی محل

آؤ پیار کی باتیں کریں !

میرے کاندھے پر سر رکھ کر۔ ایک دفعہ
تم نے کہا۔
آؤ پیار کی باتیں کریں
آج
وقت کی موجوں نے
الگ کر دیا ہمیں
تم جدا۔۔۔ میں جدا
دل جدا جذبوں سے عاری
مسکراہٹ ہونٹوں سے جدا
میرے بہتے آنسو کہتے ہیں
تیرے بکھرے قہقہے
کھنکھناتی ہنسی
تم کو مبارک بیوفا
دل کے آکاش پر اب
نہ چاند ہے نہ ستارے
زندگی کے ساز کی آواز گم
راگ کیسا
گیتوں کا دم گھٹتا ہے
آنکھوں سے اشک رواں
ماضی کی دھندلکی تصویر جاوداں ہو رہی ہے
آنسوں کے عکس میں
تم میرے کاندھے پر سر رکھ کر
کہہ رہی ہو
آؤ پیار کی باتیں کریں
آؤ پیار کی باتیں کریں۔

☆☆☆☆☆

آنکھیں

رُکا پل
پیاسی
ستائی ہوئی آنکھیں
درد سے لبریز در بدر
دھتکاری ہوئی آنکھیں
آنکھیں
جن سے درد کے آبشار بہتے ہیں
جو
خوشیوں سے نا آشنا ہیں
مسرت کے لمحوں سے بے خبر
خاک بسر ترستی، سسکتی آنکھیں
جن کے اندر اداسیوں کا مسکن ہے
کاجل کی جگہ سوز جگمگاتا ہے
آنسوؤں سے تر پلکیں لیے
بے گھر ہیں یہ آنکھیں
زمیں جن کے لیے پرائی: آسماں پرایا
وہ جئیں تو کیسے اور کن کے لیے جئیں
چاند ستارے پرائے
بہار کے سارے رنگ پرائے
دیکھنے پر بندش جن کو
یہ پابند سلاسل آنکھیں
پیاسی، ستائی ہوئی درد سے لبریز یہ آنکھیں!

☆☆☆☆☆

دھتکارے ہوئے ٹھکرائے ہوئے

ہم سے دور رہتے ہو
دامن بچا کر نظریں چُرا کر
دور کھڑے رہتے ہو
اور کہتے ہو کہ
ہم قاتل کمینے اور بدکار ہیں
غنڈے لوفر اور بے کار ہیں
ہم اوباش اور آوارہ ہیں
نظروں میں تیری ناکارہ ہیں
راستوں کے پتھر اور غلاظت کے ڈھیر ہیں ہم
معاشرے کا ناسور بدنام زمانہ سؤر ہیں ہم
دھتکارے ہوئے ٹھکرائے ہوئے ستائے ہوئے
ڈاکو لٹیرے چور اور رہزن کمینے ہیں ہم
ہاں کچھ بھی کہو وہ سب کچھ ہیں ہم مگر کس کے لیے
بس تیرے لیے۔ جن کے لیے چوریاں کی، ڈاکہ زنی کی
بینکوں کو لوٹا، قتل کئے مگر تیرے لیے
کہ تیری تجوریاں بھریں اور تو سیاست کرے!
ظلمات کے پیکر ہم ہی تھے
آپ کے سپورٹر ہم ہی تھے
سارے کے سارے ووٹر ہم ہی تھے
اور آج کیسے ناکار ہوئے؟
ہماری وجہ سے تو کامیاب ہوئے

کرسیوں کے مالک بنے
امیر وزیر اور مشیر ہوئے
انسانوں کے جنگل میں نایاب بنے
ووٹر آپ کے لیے
جھوٹے اور بوگس ہم ہی تولائے
بکسے ووٹوں سے
تجوریاں نوٹوں سے
ہم نے بھری
آج کے عملدار کالے سفید کے مختار
اور صاحب اختیار
ہماری وجہ سے ہوئے ہو
اور آج ہم ہی سے الگ کھڑے ہو
ہم ہی ٹھہرے مورد الزام
قاتل، رہزن، لٹیرے اور
جگ خوار
ہم جو قسمت کے مارے نادار ہیں
مجبور محکوم اور بے اختیار ہیں
جیلوں کی زینت، عبث لاچار ہیں
اور بس
پھانسی کے تختے کا سنگھار ہیں!

☆☆☆☆☆

ھو شو کا آخری وچن

سندھڑی میری ماں
میٹھی میری ماں
تم ہی ہو کاشی تم ہی مدینہ
تم ہی میرے مندر مسجد بھی تم ہو
تم ہی ہو گرجا میری مالک بھی تم ہو
میرا دین دھرم اور خالق بھی تم ہو
جیجل میری ماں
سندھڑی میری ماں
تیرے ہی آواز پر لبیک کہہ کر
میں نے جامِ شہادت نوش کیا
آج چلے دیس پرائے
جہاں سے کوئی واپس نہ آئے
صدیوں کی صدائیں سن کر
میں تیری صدا پر لوٹوں گا
جب بھی تجھ پر تیرگی آئی
ظلم کی چھاؤں بڑھنے پائی
رات جب دن کو نگلے گی
گھٹا ٹوپ سیاہی ابھرے گی
میں سر کا صدقہ دوں گا
یہ جاں پھر واروں گا
میں تیری خاطر ماروں گا
مروں گا پھر جیئوں گا
بار بار جیئوں گا
سندھڑی میری ماں!

تصانیف کے حوالے سے مختصر تبصرہ یا تنقیدی جائزہ

امر جلیل کو ان کے ہم عصر نقادوں نے قوم پرستی کے نعروں کی بنیاد پر بہت زیادہ تنقید کا نشانہ بھی بنایا ،ان کی کہانیوں میں عموماً علاقائی اور مقامی کردار اور مکالمے ہوتے ہیں اور ان کا اپنے لوگوں کے مظلومانہ کردار اور حالات کے بارے میں تلخ رویہ ہوتا ہے۔اس بے جا تنقید کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اتنے تلخ حقایق اور نظریات عام طور پر دنیا کے لیے نا قابل قبول ہوتے ہیں اور یہ قابلِ قدر تحریریں، سطحی اور حالات حاضرہ کا حصہ تو ہوسکتی ہیں لیکن کلاسیکی ادب کا حصہ نہیں ہوسکتی ہیں ۔اس کی بالکل واضح مثال میں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں ۔دنیا جن کتابوں کو عزت اور قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہے ۔وہ موضوعات ہیں تسلیما نسرین کی 'لجا' خوشونت سنگھ کی 'پاکستان کو جانے والی ٹرین' سعادت حسن منٹو کی 'ٹوبہ ٹیک سنگھ' کرشن چندر کی 'غدار' امرتا پریتم کی 'پنجر' اور تازہ ترین حوالہ ہندوستان ،پاکستان اور بنگلہ دیش کی 1971 کی کہانیوں کا مجموعہ جو کہ انگریزی زبان میں 'فالٹ لائنز' کے نام سے یونیورسٹی پریس لمیٹڈ ڈھاکا سے شائع ہوا۔ جس کی ایڈیٹنگ نیاز زمان صاحب اور آصف فرخی نے کی ہے ۔کیا یہ کہانیاں اور یہ کتابیں علاقائی ،مقامی یا قومیت پرستی کی ضمن میں یا پھر وقتی اور سطحی ادب میں شمار کی جاسکتی ہیں۔اگر ہاں تو پھر والیٹر، روسو، گورکی، ٹالسٹائی بھی اسی صف میں شامل ہوتے ہیں جو کہ انقلاب روس اور انقلاب فرانس کے پیش رو اور علمبردار سمجھے جاتے ہیں ۔میری کم علمی اور مختصر معلومات کی روشنی میں یہ وہ تاریخی دستاویزات ہیں جو حالات ،واقعات اور حقایق پر لوگوں کے دکھ درد

اوراذیتوں کے مختلف ادوار کی واضح ترجمانی کرتے ہیں مثلاً 'سردلاش کا سفر' جس نے کئی قسم کے استعارات کو جنم دیا اور ادبی حلقوں میں ہل چل مچا دی۔ اور تنقید نگاروں کی طرف سے بہت غیر سنجیدہ قسم کے الزامات عائد کئے اور ستم ظریفی یہ ہے کہ یہ الزامات ان لوگوں کی طرف سے عائد کئے گئے جنہوں نے عالمی ادب کا مطالعہ نہیں کیا تھا اور جو تحریر کے ٹیکنیکی مہارت سے بھی نا آشنا تھے کہ کیا لکھنا چاہیے اور کیا نہیں، وہ مہارت اور ہنر جو ہمیں بیک وقت رونے اور ہنسنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ امر جلیل کا منفرد سٹائل، مہارت، الفاظ کا فلسفیانہ استعمال اور احساسات کا محاوراتی برتاؤ امر جلیل کو سندھی ادب اور اردو انگریزی تحریروں میں اپنی مثال آپ بنا دیتا ہے۔ ان تمام تحریروں کا مطالعہ کرنے والوں کو ان کی حیران کن تخلیقات اور حقیقی فن سے محروم نہیں کیا جاسکتا۔ یہاں ان کی ایک کہانی ''برف کا تاج محل'' کے ایک مکالمے کا حوالہ دینا چاہوں گا کہ

''پتھر کے صنم سے صرف درد ہی مل سکتا ہے''

امر جلیل کی شخصیت کو بیان کرتے ہوئے میں امر جلیل کے قریبی دوست قمر شہباز کا ایک اقتباس درج کرنا چاہوں گا'' کہ ایک رات بالکل بے جا وقت ہم دونوں مٹر گشت کرنے نکلے تو میں نے امر جلیل کی شخصیت کا بالکل انجانا رخ دیکھا مجھے آج تک وہ خوشگوار منظر یاد ہے جب میں نے اس کی ذات میں ایک انجان اور اجنبی جلیل دیکھا جس کا ایک پاؤں زمین پر اور دوسرا آسمان پر تھا۔ یہ دنیا مجھے بالکل ایک اجنبی اور پُراسرار لگنے لگی ایسا آدمی جو آسمان کے گھٹا ٹوپ اندھیروں سے زمین کی پستیوں میں دھکیل دیا گیا ہو تکلیفیں اور دکھ اٹھانے کے لیے، جو بہ یک وقت ایک سخت جان سیاہ فام اور بیحد نفیس و نازک ہو۔ اس نے کہا۔

''میں بہت بدقسمت انسان ہوں جو کسی کی تلاش میں دَر بہ در بھٹک رہا ہوں۔ لیکن افسوس مجھے معلوم نہیں کہ آخر۔۔۔ میں کسے ڈھونڈ رہا ہوں'' وہ بہت دیر تک اور بہت دور تک نہ ختم ہونے والے راستوں پر میرے ساتھ چہل قدمی کرتا رہا۔ جو آج تک بھی ختم نہ ہو سکے۔ کبھی درد کے راستے بھی ختم ہوئے ہیں؟ جلیل ابھی تک اُس نامعلوم راہ کی تلاش

میں ہے جو امن، محبت، خاموشی اور سکون کی سمت جاتی ہے اس جستجو میں کئی دھوکے اور دغا بازیاں سہیں اور اس نے حیدر آباد ریڈیو کے لیے ایک ڈرامہ لکھا۔ ''زندگی کے زخم''

ڈرامہ ماضی کے دکھوں اور پریشانیوں کے تجربات کی بازگشت تھا۔ میں نے اس پہلی رات کے درد کو اپنی چشمِ نم میں سمیٹ لیا۔ ان جملوں کی گونج ۔۔۔۔۔۔ میں نے اپنے وجود میں محسوس کی۔

''میں سکندرِ اعظم ہوں، جو ظلم و استبداد کا مسافر ہے۔ جسے آبِ حیات کی تلاش ہے۔ یہی گونج دوبارہ کراچی پی ٹی وی کے ڈرامے 'ماں' میں سنائی دی۔

اس کے علاوہ وہ ایک سیاسی متحرک ادیب ہے۔ جو تمام زندگی تلخ حقائق تحریر کرتا رہا ہے۔ اپنے پڑھنے والے کو مکمل طور پر مغلوب کر لیتا ہے کہ وہ خود کو اس کہانی کا اک کردار تصور کرتا ہے۔ کیونکہ کہانی کا کردار، پڑھنے والے کے ان احساسات کی ترجمانی کرتا ہے جو وہ خود کبھی بیان نہ کر سکے۔ وہ لوگوں کے احساسات اور سوچ کی بہت خوبصورت طریقے سے ترجمانی کرتا ہے۔ ادب صرف اِک آئینہ نہیں بلکہ یہ کسی سرجن کی وہ تُند چھری ہے جو پہلے زخموں کو کاٹ ڈالتی ہے اور پھر بخیہ گری کرتی ہے۔

امر جلیل کی تحریریں ''ادب برائے ادب'' سے کوئی تعلق نہیں رکھتیں اور نہ ہی 'ادب برائے تفریح' سے ان کا کوئی واسطہ ہے۔

درد میں ڈوبی ہوئی کہانیاں کبھی کبھی دل پر اس حد تک اثر انداز ہوتی ہیں کہ آگے پڑھنا ممکن نہیں رہتا۔ ہر قسم کے جلتے ہوئے تلخ مسائل آپ ان کے کالم میں دیکھ سکتے ہیں۔ اور ٹی وی پر بات چیت کے پروگرام میں بھی۔

ہم شورش زدہ علاقے سے تعلق رکھتے ہیں جہاں کے گھمبیر مسائل دہشت گردی، چوری چکاری، ڈاکے، معاشی اور سماجی مسائل، غذا اور پانی کی قلت اور بے روزگاری کے مسائل کی آماجگاہ ہے یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک لکھنے والا ان مسائل سے بے بہرہ اور لاتعلق رہے؟

امر جلیل کے پاس اپنے نظریات بیان کرنے کا ایک اچھوتا انداز ہے۔

امر جلیل کی شخصیت کا طلسم ہے کہ انکے ہر مضمون، کہانی، کالم، ناول، ڈرامے اور فلموں

کے مکالموں میں ان کی ساحرانہ تحریر کی جھلک ملتی ہے۔ میں اس کے قلم کے ساتھ انصاف نہیں کرسکتا جو کہ تلوار سے زیادہ طاقتور ہے۔ میں پندرہ منٹ کے مختصر وقت میں اپنے کمزور قلم سے اس سندھی ادب کی اس دیو قامت شخصیت کا احاطہ کرسکوں۔ مختصراً اتنا کہہ سکتا ہوں کہ ہم سب امر جلیل کو دل کی گہرائیوں سے پیار کرتے ہیں اور وہ آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے تاریخ کے اوراق میں ہمیشہ امر رہے گا۔

گھر والوں کے تاثرات
امر جلیل اپنوں کی نظر میں

امر جلیل کی بیگم مسز تسنیم جلیل کے تاثرات

ناگپال: بھابھی آپ کی ان سے پہلے ملاقات کب اور کہاں ہوئی؟

مسز جلیل: کچھ یاد نہیں آرہا کہ پہلی دفعہ کب اور کہاں ملے

ناگپال: بھابھی یہ شادی پسند کی تھی یا ارینج؟

مسز جلیل: شادی پسند کی تھی۔

ناگپال: شادی کے ابتدائی دنوں میں، درمیان اور اب یہ کیسے رہے۔

مسز جلیل: شروع میں بس ٹھیک تھے کوئی خاص خیال نہیں رکھتے تھے۔ درمیانہ عرصہ ان کا مصروف ترین عرصہ تھا کہ نوکری اور کام میں مگن ہی رہے۔ اب وہ میرا بے حد خیال رکھتے ہیں اتنا کہ شاید ہی کوئی کسی کا رکھتا ہو!

ناگپال: جلیل صاحب تو بے حد مقبول شخص رہے ہیں، اب بھی ہیں تو جوانی کے زمانے میں ان کے گرد تو لڑکیاں منڈلاتی ہونگی آپ کو کبھی ان سے شکایت رہی؟

مسز جلیل: بالکل نہیں رہی۔ ہاں لڑکیوں میں ضرور گھرے رہے، فلم ٹی وی تو ایسے شعبات ہیں کہ رات رات بھر گم رہتے۔ ایک دفعہ میں بے چین ہو کر انہیں نند کے ساتھ ڈھونڈنے نکل پڑی، ساری رات جاگنے کی وجہ سے نیند سے آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں۔ ہماری اس حرکت پر بہت ناراض ہوئے۔ عورتیں ان کی سادہ لوحی سے بھرپور فائدہ اٹھاتی رہیں۔ کام لیتی رہیں، مگر کام میں

وہ اس طرح مگن ہو جاتے ہیں کہ ان کو وقت گزرنے کا بھی احساس نہیں ہوتا ہے کہ کتنا وقت گزر گیا ہے۔

ناگپال: ان کی کچھ بُری عادات؟

مسز جلیل: دیر تک کام کرنا اور دیر سے سونا، اب تک یہی عادت ہے۔ ڈسپلن ان میں بہت کم ہے۔ وہ زیادہ ہونا چاہیئے تھا باقی تو وہ بہت خوبصورت اور بہت اچھے شخص ہیں۔

میں نے ایسا شخص کبھی نہیں دیکھا، اپنے رشتے داروں میں بھی نہیں۔ وہ مجھے غیر معمولی پیار کرتے ہیں، مجھے کچھ بھی ہو تو پریشان ہو جاتے ہیں بہت، بہت، بہت خدمت کرتے ہیں۔ مجھے ان سے نہ کبھی شکایت رہی نہ گلہ۔

ناگپال: اگر دوسرا جنم ملے تو آپ کا انتخاب؟

مسز جلیل: میں انہیں کو ہی منتخب کروں گی۔

ناگپال: انہیں غصہ کب آتا ہے؟

مسز جلیل: جب انہیں کوئی کام میں ڈسٹرب کرے۔ لکھتے ہوئے وہ محو ہو جاتے ہیں۔ ڈوب جاتے ہیں، اس دوران کوئی فون بھی آجائے تو پیشانی پر بل پڑ جاتا ہے۔

ناگپال: وہ خوش کب ہوتے ہیں؟

مسز جلیل: جب کوئی اپنی تخلیق پوری کرتے ہیں بہت خوش ہوتے ہیں۔ چھوٹے بچوں کی طرح خوش ہوتے ہیں۔ مجھے باہر لے جاتے ہیں آئسکریم کھلاتے ہیں۔ چھوٹے بچوں سے انہیں بے حد لگاؤ ہے۔ بچے بھی جلد ہی ان سے مانوس ہو جاتے ہیں، دوستی کر لیتے ہیں۔

ناگپال: کھانے میں انہیں کیا پسند ہے؟

مسز جلیل: یہ تلی ہوئی چیزیں شوق سے کھاتے ہیں، چٹپٹی چٹخارے دار دہی بڑے، پھلکیاں، چاٹ مرچ مصالحے والی اشیاء۔

ناگپال: ان کے طبیعت کی کوئی خاص بات

مسز جلیل: جھگڑے سے نفرت کرتے ہیں، لڑائی خون خرابا انہیں انتہائی ناپسند ہے گھر میں اپنائیت اور خوشگوار ماحول چاہتے ہیں۔

پیسوں کے بالکل لالچی نہیں، حریص نہیں، کوئی دھوکہ دے دے جو کہ بہت زیادہ کامن ہے، اتنی سادہ طبیعت ہے کہ کبھی شکایت نہیں کریں گے، کسی سے گلہ نہیں کریں گے۔ لوگ آسانی سے انہیں لوٹ لیتے ہیں اور وہ مسکرا دیتے ہیں۔

ناگپال: کوئی تمنا

مسز جلیل: کاش میں ان کی سیکرٹری رہتی تو انہیں ان لوگوں سے بچاتی، انہیں فلم والے، ٹی وی والے، کئی پبلشرز لوٹ گئے اور یہ چپ۔ میں ان کی سیکرٹری ہوتی تو ان سے سارا حساب لیتی! حرفِ آخر کہ یہ ایک بہت بھلے شخص ہیں، کسی سپنے کی طرح پیارے سے!

امر جلیل کی پوتی انعم سید کے تاثرات

انعم سید 14 سال کی طالبہ ہیں وہ ایبٹ آباد میں زیرِ تعلیم ہیں، جس سے امر جلیل اپنی روح کی گہرائیوں سے محبت کرتے ہیں۔ اسلام آباد سے کراچی منتقل ہو کر وہ مہینوں بیمار پڑے رہے۔ ان کے دل و دماغ بری طرح سے متاثر ہوئے۔ یہی حال انعم کا بھی رہا جب وہ بہت چھوٹی تھیں۔ آخر امر جلیل اُسے کراچی لے کر آئے اور اس خیال سے بہلا دیا کہ دیکھو کراچی کا موسم، سمندر اور یہ خوبصورت شہر جو روشنیوں کا شہر اور پاکستان کا سب سے بڑا شہر ہے، اس میں بھی انعم کا گھر ہے۔

امر جلیل اسے اپنی جان سمجھتے ہیں۔ وہ کہتی ہیں۔

''دادا میرے بہت بہت اچھے ہیں۔ وہ گریٹ ہیں۔ انہوں نے مجھے بچپن سے پرورش کیا اور بہت بہت پیار کیا ہے۔ میرے دادا بہت بڑے تخلیق کار ہیں، نئی نسل کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ ان کی دلچسپیاں نئی نسل کی دلچسپیوں سے الگ نہیں۔ ان کے پاس ڈیسک ٹاپ کمپیوٹر ہے، لیپ ٹاپ ہے، آئی پاٹ ایم پی تھری پلیئر ہے۔ جدید موبائل فونز ہیں۔ وہ اپنی جنریشن کے ساتھ ساتھ نئی نسل کی طرح میوزک بھی سنتے ہیں اور ایک وسیع کلیکشن بھی رکھتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ

مجھے رائٹر کی جگہ اسپورٹس مین زیادہ لگتے ہیں۔دادا روح کی گہرائیوں سے لکھتے ہیں وہ بڑے جینیس ہیں۔انہیں کسی سے ڈر نہیں لگتا سوائے اسپائیڈر کے۔وہ اسپائیڈز سے ڈرتے ہیں۔وہ اچھے کک ہیں۔وہ تھوڑی چیزیں پکاتے ہیں مگر بہت اچھی پکاتے ہیں۔وہ بچوں سے بہت پیار کرتے ہیں اور بچے بھی ان سے جلد ہی مانوس ہو جاتے ہیں۔دادا سب کا خیال رکھتے ہیں۔''

میرے دادا بہت بہت پیارے انسان ہیں اور میں انہیں بہت بہت زیادہ پیار کرتی ہوں۔I love him,I love him,I love him much میرے دادا ہمیشہ سلامت رہیں مسکراتے رہیں۔

دادا زندہ باد۔''

پروفیسر ڈاکٹر کلثوم قاضی۔کراچی یونیورسٹی

امر جلیل کی بیٹی جو اصل میں ان کی بھتیجی ہیں اور اس وقت کراچی یونیورسٹی کے شعبہ سوشل ورک میں ایسوسیٹ پروفیسر اور چیئر پرسن ہیں۔وہ کہتی ہیں:

''پیدائش کے وقت سے یہ میرے ساتھ ہیں اور یہی میرے وارث بھی ہیں''

''میں نے جب ہوش سنبھالا تو چاچا، دادا اور دادی کو ہی دیکھا۔میں 3 مہینے کی تھی کہ ماں مجھے میرپور خاص سے لے کر آئیں اور اتنا پیار دیا کہ میں انہیں کی ہو کر رہ گئی۔میرے وہ ابو ہیں، جب میں گھر میں بڑی ہوئی، بولنے لگی تو اپنی امی کو بھابھی ماں کہنے لگی کیونکہ ابا (امر جلیل) اسے بھابھی کے نام سے پکارتے تھے۔8 سال بعد علم ہوا کہ جس کو بھابھی کہتی ہوں وہی میری سگی ماں تھی۔چاچا اور چاچی نے مجھے بے انتہا پیار دیا ہے، آج بھی اسی چاہت سے رکھتے ہیں۔پھوپھی جو چاچا سے بھی بڑی تھیں ان کی مار سے بھی بچاتے تھے۔وہ ان کو کچھ کہہ تو نہیں سکتے مگر اپنے غصے کا عجیب انداز سے اظہار کرتے ہیں۔ایک دفعہ انہوں نے رکھا ہوا پانی کا مٹکا اٹھا کر زور سے زمین پر دے مارا۔اسطرح ہمیشہ میری فیور کرتے رہے، بہت پیار دیا اور ہر فرمائش پوری کی۔لکھنا پڑھنا انہیں سے سیکھا۔کتابیں خریدنا انہیں ترتیب سے رکھنا، سجانا، سنوارنا اور شیلف بنانا، ہر سلیقہ

انہیں سے سیکھا۔ اپنے لیے دلی سے شمع منگواتے تھے تو میرے لیے بھی کھلونا، نامی بچوں کا رسالہ آتا تھا۔ ادب پڑھنا اور اچھے رائیٹرز کا شعور بھی ان سے ملا۔ وہ کرشن چندر کو بہت پڑھتے تھے تو کرشن مرا بھی فیورٹ رائیٹر ٹھہرا۔ انقلابی فکر سے ہمکنار کیا۔ میں انہی کو ہی آئیڈ لائیز کرتی ہوں۔ ریڈیو، ٹی وی پر روشناس کرایا۔ جہاں بھی جاتی ان کی وجہ سے پہچانی جاتی ہوں، بہت عزت ملتی ہے۔ بہت ہی شفیق اور پیار کرنے والے ہیں مجھے دل و جان سے چاہتے ہیں۔

وہ سب کی عزت کرتے ہیں، نہایت رواداری سے پیش آتے ہیں۔ بڑے مخلص اور پر خلوص انسان ہیں۔ پھوپھی کو ماں کی جگہ سمجھتے ہیں کبھی بدتمیزی سے بات نہیں کرتے۔ ہم نے ادب اور احترام کرنا بھی ان سے سیکھا۔ وہ ایک عظیم انسان ہیں اور اعلیٰ انسانی اقدار کے مالک ہیں۔ جتنے بڑے رائیٹر ہیں اس سے بڑے وہ انسان ہیں۔ پر خلوص، نیک اور وضع دار۔

اشرف خاتون (امر جلیل کی بڑی بہن)

امر جلیل کی ان سے 12، 13 سال بڑی بہن جن کی عزت و احترام وہ ماں کی طرح کرتے ہیں۔ بتاتی ہیں۔

میں ان سے بارہ سال بڑی ہوں اور میں نے انہیں گود کھلایا ہے۔ 1960ء میں امی کا انتقال ہوا تو یہ ابھی بائیس سال کے تھے۔ انہیں ائرفورس میں جا کر پائلٹ بننے کا بے حد شوق تھا مگر امی نے انہیں جانے نہ دیا اور سخت مخالفت کی۔ انہیں بہت غصہ آیا اور کراچی چھوڑ کر نوابشاہ پڑھنے چلے گئے۔ امر جلیل ہمیں بچوں کی طرح پیارے ہیں۔ میں نے انہیں گود کھلایا ہے وہ بہت ہی ہونہار، باادب اور اچھے انسان ہیں۔ کبھی غصہ ظاہر نہیں کرتے نہ کسی کو برا بولتے ہیں۔ اپنے زبان پر پورا قابو رکھتے ہیں پیٹھ پیچھے بھی کسی کی گلا، غیبت نہیں کرتے۔ ہمارے محلے میں، جب ہم سعید منزل بندر روڈ پر رہتے تھے ان کے دوست اختر صدیقی تھے جو آگے چل کر DSP کرائمز ہوئے، ان کے ابا بھی پولیس افسر تھے۔ انہوں نے آ کر امر جلیل کے دل کی بات بتائی کہ وہ تسنیم کو پسند کرتے ہیں جو وہ خود تو کبھی نہ کہہ پاتے۔ تو ہم نے انہیں دیکھا تو پسند کیا اور ان کی 1963ء میں شادی

کروادی۔ تسنیم ایک کشمیری لڑکی ہیں جو پہلے تو اردو بولتی تھیں مگر جلد ہی سندھی سیکھ لی اور اب وہ ہمیشہ سندھی میں ہی بات کرتی ہیں۔ وہ بھی نہایت سلجھی ہوئی باادب خاتون ہیں۔

جلیل چٹپٹی اشیاء کھانے کے بے حد شوقین ہیں برنس روڈ پر وہ اپنے رشتے دار رفیق سے کھانے کے مقابلے بھی کرتے تھے۔ جتنا اچھا لکھتے ہیں اتنا ہی اچھا ان کے بولنے اور بتانے کا انداز ہے۔ سننے والا کسی جادو اور سحر میں گرفتار ہو کر پوری دلجمعی سے ان کو سنتا ہے نہایت اثر انگیز اسٹوری ٹیلر ہیں۔

میں آج بھی ان کو اتنا ہی چاہتی ہوں اور ہفتہ بھر بھی ان سے نہ ملنا گوارا نہیں، جلیل نہایت پیارے بھائی ہیں! کلثوم کو ہم نے بھابھی سے لے کر پالا اور امر جلیل اسے بیٹی کی طرح چاہنے لگا۔ یہ میرے لئے بچوں جیسا بھائی ہے۔ ہمارے والد محترم 1971 تک زندہ رہے اور ہم سب آپس میں بہت خوش و خرم رہتے ہیں۔

ہم عصر ادیبوں کے امر جلیل کے فن اور شخصیت پر تاثرات اور ناقدین کی آرا

زورِ قلم

''ہم سرکس کے وہ مسخرے ہیں جو اسٹیج پر ہنسانے کے بعد پردے کے پیچھے آ کر رونے لگتے ہیں۔''

تو یہ ہے ان کا زورِ قلم جو چارلی چپلن کی یہ بات دھرا دیتا ہے کہ میں بارش میں باہر اس لئے آ جاتا ہوں کہ لوگ میرے آنسو نہ سیکھ سکیں۔

طبقاتی سماج میں پستی ہوئی سندھ آج بھی ان دو پاٹوں میں پس رہی ہے جب امر جلیل نے کہانی ''منهنجي دل موهن جو دڑو'' (میرا دل موہن جودڑو) میں لکھی۔

''ہماری شادی میرے باپ اور تمارے ڈیڈی کے سماجی رتبوں کے مابین فٹ بال میچ پر منحصر ہے۔ جس میں میرا باپ زخمی گول کیپر ہے۔ میں طبقاتی کشمکش کے جوہڑ سے ابھر کے تمہارے خاندان کے کاندھے سے نہیں ملا سکتا۔''

اسی طرح کہانی ''عظمت جو ثبوت'' (عظمت جو ثبوت) میں ظلم و استبداد کی یہ شکل پیش کرتا ہے۔ دبلے پتلے سے موٹے نے پوچھا ''کیا تو اب بھی میری عظمت سے انکار کرتا ہے؟''

دبلے پتلے نے مریل آواز میں جواب دیا ''نہیں''

اپنی گرفت ڈھیلی کرتے ہوئے اس نے کہا ''میں عظیم ہوں؟''

''ہاں تو عظیم ہے''

''میں برتر بھی ہوں؟''

''ہاں تو برتر بھی ہے''

''میں تیرا خیر خواہ ہوں؟'' موٹے نے اپنا ہاتھ دبلے کے کاندھے سے ہٹاتے ہوئے پوچھا

''تیرا ہمدرد بھی ہوں؟''

''ہاں تو میرا خیر خواہ بھی ہے اور ہمدرد بھی ہے۔''

''شاباش تو وفادار شہری ہے'' موٹے نے اپنے بھاری ہاتھ سے دبلے کے شانے پر قدر شناسی کے انداز میں تھپکی دی۔

تو سب آج بھی رواں دواں ہے۔ ابھی ابھی ٹی وی نے بتایا کہ دو پیار کرنے والے دلوں کو، جنہوں نے بھاگ کر شادی کی تھی، قتل کر دیا گیا ہے۔ تاریخ لکھنے کی ضرورت نہیں، ٹی وی کھولئے، اخبار دیکھئے، خبر مل جائے گی۔

عام ادیب یہ سن کر پھولا نہیں سماتا کہ وہ تین نسلوں میں یکساں مقبول ہے۔ ہم نے اپنے بچوں کے بستوں میں "دل جي دنيا" (دل جی دنیا) دیکھا ہے۔ ایک کالج لڑکی کو جب یہ کتاب کسی بک اسٹال پر نہ ملی تو اس نے پوری کتاب رجسٹر پر ہاتھ سے لکھ کر اتار لی۔ ہاں تو جب انہیں بتایا گیا کہ نئی نسل بھی چربٹ اور چینی کو چاہتی ہے تو انہیں دکھ ہوا۔ ہاں آپ نے ٹھیک پڑھا ہے انہیں دکھ ہوا کہ 50 سال پہلے لکھے ہوئے مسائل اور الجھنیں اب بھی زندہ جاوید ہیں! کہ آج بھی ان مسائل پر لکھی گئی کہانیاں پرانی نہیں ہوئیں۔ یہ ہے سندھ کی دھرتی کا المیہ جو انہیں المناک کر دیتا ہے۔ ان کے نین کٹورے موتیوں سے بھر جاتے ہیں۔ جب اس دھرتی پر آج بھی عورت بکتی ہے، لٹتی ہے، کٹتی ہے۔ بچے بھکاری بن کر گڑگڑاتے ہیں، گیراج میں کام کرتے ہیں، گدھے گاڑی چلاتے ہیں۔ کسان اور مزدور آج بھی بھوکا ننگا ہے۔ تعلیم اور زیادہ غائب ہوگئی ہے۔ انگریزی تو کیا سندھی اور اردو بھی سکولوں میں صحیح نہیں سکھائی جاتی۔ پیر، وڈیرے، رہزن، ڈاکو آج بھی اس دھرتی پر اسی طرح راج کرتے ہیں۔ جیسے 1955 میں جب امر جلیل نے دنیائے ادب میں پہلا

قدم رکھا۔ کیونکہ وہ اپنی ذات کے لئے نہیں دھرتی کے زخموں کو روتے ہیں جو آج بھی اسی طرح جوان ہیں۔ جب وہ خود بوڑھے ہوگئے ہیں یہ احساس ہی افسردہ کر دیتا ہے۔ اور ہم سب اس کے ساتھ سوچتے ہیں۔ ہمارا دل بھی اسی طرح دھڑکتا ہے اور ان کی تحریریں، کالم، کہانیاں اور ٹی وی ٹاک شوز، ہمیں اور حساس اور باخبر رکھتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سندھی شاعری میں شاہ لطیف کے جتنے شیدائی ہیں اتنے ہی نثر میں امر جلیل کو پسند کرنے والے پائے جاتے ہیں۔

اپنی اس تحقیق کے دوران میں نے جو کتب زیر مطالعہ لائی ہیں ان میں کچھ معیاری تحریریں ہیں جو دل کو چھو لیتی ہیں۔ میں انہی کے الفاظ میں قارئین کرام تک پہنچانا چاہتا ہوں۔ تو اقتباس لیتے ہوئے میں نے اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ وہ انہیں کے الفاظ ہوں اور اسی تاثر کے ساتھ آپ تک براہ راست پہنچیں۔

لحاظ میں نے انہیں ان کے نام سے ہی دینے کی سعی کی ہے بجائے اس کے کہ ان کو حوالے کے طور پر خود لکھتا۔ اس سے امر جلیل کی شخصیت نکھر کر پڑھنے والوں کے سامنے آتی ہے اور وہ ان کے فن فکر سے بہتر طور پر آشنا ہوں گے۔

تو میں اور زیادہ مخل ہونا نہیں چاہتا۔ تو لیجئے سنئے کہ لوگ ان کے متعلق کیا کہتے ہیں۔

انور

امر جلیل سندھی ادب کا ایک ترقی پسند کہانی نگار ہے۔ جس کی کہانیاں اعلیٰ متوسط اور ادنیٰ متوسط طبقے کی نمائندگی کرتی ہیں۔ ہر سماج میں یہی دو طبقے ہوتے ہیں جو کسی قوم کے ابتدائی ارتقائی مراحل کے ذمے دار ہوتے ہیں۔ امر کا اپنا طبقہ اور طبقاتی کردار بھی یہی ہے۔ اس لئے اس کا ادب بھی اس طبقے کی نمائندگی کرتا ہے۔ سندھ میں جاگیر دار اور وڈیروں سے قطع نظر درمیانہ طبقہ، ہاریوں اور مزدوروں کے ادنیٰ طبقے سے زیادہ ذہنی کشمکش میں مبتلا ہے۔

سندھی ادب کے ایک نمایاں کہانی نویس کی حیثیت سے یوں تو امر نے تقریباً ہر موضوع پر لکھا ہے۔ مجموعی طور سے ہر طبقے کا قومی رنگ میں ڈوبا ہوا تذکرہ اس کی کہانیوں میں ملتا ہے۔ جہاں تک

نچلے مزدور طبقے کا تعلق ہے اس نے ''میرا دل موہنجودڑو'' کہانی میں طبقاتی کشمکش کو بہت خوبصورت انداز میں سمجھایا ہے۔اس لئے کہا جاتا ہے کہ امر سندھی ادب کا گورکی نہیں کرشن چندر ہے۔

سندھی ادب پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ نظم میں ایاز اور افسانوی نثر میں امر نے سندھ میں قومی شعور پیدا کرنے کے لئے انقلابی کام سرانجام دیا ہے۔

سلیم میمن

امر جلیل کے کردار مصنوعی ،من گھڑت اور فرضی نہیں اور نہ ہی آسمانی فرشتے ہیں بلکہ وہ ہم میں ہیں، ہم جیسے ہیں۔اس کے افسانوں کے کردار ہمارے معاشرے میں چاروں طرف بکھرے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔اس کے کچھ کردار صابر اور ہر حال مین خوش رہنے والے کچھ بہادر، بردبار اور ہمت والے اور کچھ دکھی اور شکست خوردہ ہیں۔ان کے ایک افسانے ''سوجھرو'' میں واحد چچا کا کردار ایک ایسا کردار ہے جو زمانے کی ہر مشکل کا سامنا پامردی سے کرتا ہے۔ درحقیقت امر جلیل کی کردار نگاری کا انداز اتنا اچھوتا اور پر اثر ہے کہ پڑھنے والے کی ہمدردیاں از خود انہیں حاصل ہو جاتی ہیں کیونکہ یہ کردار مجبوریوں بے بسیوں اور بدحالیوں میں بدمست اپنے بھولپن کا مظاہرہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔کسی کو ذریعہ معاش کا مسئلہ ہے۔کسی کو رہائش کا تو کسی کو جوان بیٹیوں کا مسئلہ ہے۔جلیل کا انداز نہایت سلیس اور سادہ ہے۔وہ جو کچھ جیسے اور جس حال میں دیکھتا ہے اسے اس انداز میں قارئین تک پہنچا دیتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ پڑھنے والے ان کرداروں کو اپنا محسوس کرتے ہیں ان کے درد اور دکھ کو اپنے درد اور دکھ سمجھتے ہیں۔مکالمے جلیل کے افسانوں کی جان ہیں۔جن کے بغیر اس کے افسانوں میں وہ بانکپن نہیں رہے گا اور ان کے افسانوں کی خوبی بھی ہے کہ وہ کردار کا قاری سے براہ راست رابطہ قائم کروا دیتا ہے اور جب کردار قاری سے ہم کلام ہوتا ہے تو قاری کا اور کردار کا درمیانی فاصلہ مزید گھٹ جاتا ہے۔وہ معاشرے کے مختلف مسائل اور برائیوں کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ بظاہر اس کے مکالموں کی طنز و مزاح، تلخی زہر سے بھی زیادہ کڑوی لگتی ہے۔اس کی مکالمات مقصدیت سے بھرپور ہوتے ہیں جس

میں سے ہر طبقہ فکر اور اپنی اہلیت کے مطابق الگ الگ مطلب لیتا ہے۔

امر جلیل نے اپنے افسانوں میں مختلف مناظر کو بھی انتہائی خوبصورت اور دلکش پیرائے میں پیش کیا ہے۔ اپنے افسانے ''خونی رات'' میں سردیوں کی سیاہ رات کی جس خوبصورت انداز میں منظر نگاری کی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے اور پڑھنے والا اس میں ڈوب جاتا ہے۔ امر جلیل کے افسانوں میں حقیقت نگاری کا عنصر غالب ہے اور اس نے اپنے سماج اور ہمارے معاشرے پر اپنے ہر افسانہ میں بھرپور طنز کیا ہے۔ امر جلیل ایک حقیقت پسند فنکار ہے جو اپنے وقت ماحول اور دور کا سب سے زیادہ حساس، بہادر اور سچ گو افسانہ نگار ہے جو زمان اور مکان کی حدود پھلانگ کر ہر دور میں سچ اور انصاف کی علامت بن چکا ہے۔

ڈاکٹر سحر امداد شاہ

کسی زمانے میں ہمارے ہاں صرف ایکٹرز اور کرکٹرز ہی گلیمر کی دنیا کے باسی تھے۔ پر آج سیٹلائٹ چینلز کے دور میں ایک صحافی، کرکٹرز اور ایکٹرز سے زیادہ گلیمرس بن چکے ہیں۔ پر ہمارے امر جلیل کچھ زیادہ ہی خوش نصیب نکلے کہ آج سے تیس پینتیس سال پہلے ہی انہوں نے یہ مرتبہ پایا۔ یوں امر جلیل سندھی کے پہلے اور اب تک آخری گلیمرائزڈ ادیب وصحافی ہیں۔

ذوالفقار علی بھٹو شہید کے پہلے حکومتی دور میں ہلال پاکستان (اخبار) میں اپنے مقبول ترین کالم ''تنھنجون منھنجون ڳالھیون'' کے ذریعے انہوں نے گلیمرائزڈ جرنلزم کی بنیاد رکھی۔ ان کے کالم کی مقبولیت نے ایک نئی اخبار کی بزنس کو بڑھاوا دینے میں اہم رول ادا کیا۔

مجھے یاد ہے ان کالموں میں وہ رومانس کے ساتھ ساتھ طنز و مزاح کا تڑکا بھی دیا کرتے تھے۔ ان کالموں کے کچھ مقبول اور مستقل کردار تھے۔ سندھو، چینو، چربٹ اور موگو مٹرو غیرہ جو آج بھی لوگوں کو یاد ہیں اور یہی ان کی یاد کا سب سے بڑا حوالہ ہے۔

سراج الحق

جیسے کہ آپ جانتے ہیں کہ شہید ذوالفقار علی بھٹو نے سندھی زبان میں ایک اخبار ہلال پاکستان

کراچی سے شروع کی تھی۔ مجھے اس کا چیف ایڈیٹر بننے کا حکم ملا۔ مشکلات کا جو سلسلہ شروع ہوا تو ختم ہی نہ ہوتا تھا پھر سندھی ادیبوں کا ملنا جو پی پی پی کے اخبار میں لکھیں۔ شروع میں تو میں نے ایڈیٹوریل کے ساتھ سیاسی اور سماجیات پر تبصرے بھی لکھے اور ایک مزاحیہ کالم ''ملان جي دوڙ'' بھی لکھا وغیرہ وغیرہ پر اخبار کی اشاعت بڑھنے میں نہ آ رہی تھی۔ تو پھر اس وقت میں نے جلیل سے کہا کہ وہ میرے لئے اخبار میں کالم لکھے۔ وہ حکومتی حلقوں میں ایک متضاد شخصیت تھا اور پھر ایک سرکاری ملازم جو ریڈیو پاکستان میں کام کرتا تھا۔ ان تمام مشکلات کے باوجود اس نے کالم لکھنا اس شرط پر قبول کیا کہ میں اس کے کسی بھی لفظ، پیراگراف یا کالم پر اپنی قینچی نہیں چلاؤں گا۔ تو ہم نے کالم ''تنهنجون منهنجون ڳالهيون'' اخبار میں لانا شروع کیا۔

میں ان کا مشکور ہوں کہ انہوں نے مجھے کبھی شرمندہ نہیں کیا، کچھ بھی صورتحال سامنے ہو، شہر میں دنگا فساد ہو ان کا کالم ہمیشہ مجھے وقت پر ہی ملتا رہا۔ اور اس کالم نے اخبار میں بجلی بھر دی اور جلد ہی روزنامہ جنگ کی اشاعت اور مقبولیت سے مقابلہ کرنے لگے۔ مگر وہ بہت مشکل دور تھا۔ کچھ جیالے، ایم این اے اور ایم پی اے ان کالموں سے قطعی خوش نہ تھے اور انہوں نے وزیراعلیٰ اور خود بھٹو شہید تک اس کی شکایت کر دی۔ امر جلیل کالم کے ساتھ ساتھ سندھی کہانیاں بھی لکھتے رہے اور کچھ تحریریں متعصب سندھی پریس کا شکار ہو گئیں۔

خاص طور پر ان کی کہانی ''سرد لاش جو سفر'' یہ نثر کا وہ شہہ پارہ تھا جسے کسی بھی برصغیر اور یورپین ادب کے عظیم افسانے کے مدمقابل لا کھڑا کیا جا سکتا تھا۔ پر اس نے میرے لئے، اپنے لئے مصیبتوں کا ایک پہاڑ کھڑا کر دیا۔ جہاں حکومت نے امر جلیل کے لئے وارنٹ گرفتاری نکال دیئے اور وہ انڈر گراؤنڈ ہو گیا۔ اخبار پر بھی اس کا برا اثر پڑنے لگا کہ ہم کبھی ایک دو کالم شائع نہ کر پاتے تھے۔ میں نے بندر روڈ پر واقع اپنے دفتر کی چابیاں اٹھائیں اور لاکر محمد خان جونیجو، جو اس وقت حکومت سندھ کے سیکرٹری داخلہ تھے، کے سامنے رکھ دیں۔ بڑے اکھڑے انداز میں میں نے انہیں کہا میں وزیراعلیٰ سے یہ درخواست نہیں کروں گا کہ وہ یہ وارنٹ گرفتاری واپس لیں آپ انہیں مطلع کر دیں کہ سراج نے ہلال پاکستان کی چابیاں واپس کر دی ہیں اور کہا ہے کہ اگر

جلیل کے وارنٹ گرفتاری واپس نہ لئے گئے تو کل سے اخبار ہلال پاکستان نہیں نکلے گی۔ دھمکی نے کام کیا اور ان کے وارنٹ واپس لے لئے گئے۔ اب میں ان کے ادبی کاموں پر آتا ہوں۔ میں اس کے تمام کام عالمی معیار کے اعلیٰ ادب کے پہلی صف میں شامل کروں گا۔ امر جلیل پاکستان کے سمرسٹ ماہم ہیں اور مختصر کہانی میں وہ او ہنری، موپاساں، کافکا اور ساتر کے برابر ہیں۔ اردو ادب میں میں ان کا شمار کرشن چندر اور راجندر سنگھ بیدی کے ساتھ کروں گا۔ مجھے یہ کہنے دیں کہ میں نے جلیل کو ہمیشہ رابندر ناتھ، ٹیگور سمجھا ہے ان کا ڈکشن بھی ٹیگور جیسا ہے اور کردار و منظر نگاری بھی اتنی ہی بھرپور کرتے ہیں اگر وہ اپنی داڑھی ایک سال اور چھوڑ دیں تو ہمیں اپنا سندھی ٹیگور مل جائے گا۔

آصف فرخی

میرے لئے امر جلیل ایک شخص سے زیادہ لکھنے کا ہنر ہے۔ انداز تحریر خود سے بھی بڑا ہے۔ خیالات اور سوچ کی خلا کو الفاظ اور اظہار سے کیسے بھرتے ہیں۔ ہم عصر حالات و واقعات کو زبان دینے کا فن اور انہیں تسلسل سے جوڑنے کا انداز ہیں۔ امر جلیل تاریخ کے وہ واقعات جنہیں اکھاڑ کر پھینک دیا انہیں سمیٹ کر لانا اور ان کہے ختم شدہ احساسات کو زبان دینا، گمنام کرداروں کو لازوال اور امر تا بخشنے والا کہانی کار ہیں، امر جلیل تاریک گوشوں، کٹڑیوں کے کناروں میں سچ تلاش کرنا اور ملک کے پناہ گزین، مکروہ حقائق کو ڈھونڈ کر کہانی کے قرۂ پر الفاظ سے تصویر آویزاں کرنے کے ہنر کا نام ہے۔ امر جلیل حال میں بہتے ہوئے خونی واقعات، انسانی وحشت اور بربریت کی کھلی داستاں رقم کرنا، آگہی کی سولی چڑھنا اور منصوری صدا سے بہ آواز بلند انا الحق کا نعرہ مارنا جیسے ''تاریخ جو کفن'' کہانی میں اسلامی تاریخ کے شہرہ آفاق علامہ اقبال کی آواز'' ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز'' کو ملیا میٹ کر دیا کہ کالا حبشی ایاز نماز کی صف میں ایک اعلیٰ افسر محمود کے شانہ بشانہ کھڑا نہ ہو سکا اور تمام دعوے اور برابری کے وعدے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ انتظار حسین کی ''بن لکھی رزمیہ'' جیسے ملکی تاریخ میں فرد کی تقدیر کی عکاسی کرتی

ہے امر جلیل نثر میں روشدہ تاریخی حقائق کو سمیٹ لاتا ہے جیسے "سرد لاش جو سفر"، کہانی جس کی ماہوار سوھٹي میں پہلی اشاعت فساد کھڑا کر دیتی ہے۔ رسالے کو بند کر کے ایڈیٹر کو قید کر دیا جاتا ہے۔ کندھ کوٹ میں مذہبی فسادات میں جو ہندوؤں کے ساتھ ہوا اس جبر و بربریت کو جو آج بھی کسی نہ کسی شکل میں نمودار ہوتی ہے، اس کہانی میں محفوظ کیا گیا ہے۔ انداز بیان اس قدر اثر انگیز ہے کہ قاری کانپ اٹھتا ہے اور اس طریقہ تحریر میں کچھ اور کہانیاں بھی رقم کی گئی ہیں جیسے ''کپیل پاھن جو وارث'' میری بہت ہی پسندیدہ کہانی ہے۔ دوسری دفعہ اشاعت پر مصنف نے ایک نوٹ میں لکھا ہے کہ ''یہ کہانی 1972 کے ون یونٹ کے دوران لکھی گئی جب مارشل لاء کے اثرات اور نمایاں ہو کر سندھی ادب کو تحرک بخش رہے تھے تو اس وقت یہ مزاحمتی ادب آشکار ہوا۔ تو پہلی دفعہ کہا گیا کہ یہ مزاحمتی ادب پھر جمہوری دور میں بھی بدنام کیا گیا۔ مگر امر جلیل کا ادب اس تنگ خیالی سے بہت ہی اونچا ہے۔ کراچی کے خونریز واقعات کو قلم بند کیا گیا۔ ''کپیل پاھن جو وارث'' میں اس طرح وہ نہ لکھی گئی تاریخ کو اپنے کہانیوں میں لکھ ڈالتا ہے۔ ایک مرتب کی حیثیت سے میں ان کی کہانیوں سے بے حد مستفید ہوا ہوں۔ میرے دو مجموعے Fires in An Autumn Garden جس میں پاکستان کی تاریخ پر ادیبوں کا انوکھا انداز تحریر دستاویز بن گیا ہے اور دوسرا Fault Lines جس میں سن 1971 کے واقعات کی کہانیاں شامل ہیں۔ میرے لئے امر جلیل ایک نعمت بن کر سامنے آتے ہیں جن کا تاریخ سمیٹ کر کہانی بنانے کا اچھوتا انداز ہے اور وہ تاریخ ہی لکھتے آتے ہیں کالم ہو یا ان کی کہانی۔

عبدالحمید آخوند

میں امر جلیل کو 40 سال سے جانتا ہوں اس لمبے عرصے میں نے امر جلیل کو کبھی کسی فائدے کے لئے بھاگتے نہیں دیکھا چاہے وہ ان کا حق ہی کیوں نہ ہو۔ صاحب اقتدار لوگوں کے پاس تو کبھی نہیں جاتے جو وقت کی بیساکھیوں پر آج بڑے آدمی بن بیٹھے ہیں۔ وہ درباری بالکل نہیں ہیں جیسے کہ اس کے زیادہ تر ہم عصر ادیب ہیں۔ وہ جو ایک دوسرے کو دھکیل کر سرکار نامدار کے

قریب جانے کی تگ ودو میں لگے رہتے ہیں اور اپنی کتب سرکاری یا نیم سرکاری اداروں سے چھپوا لیتے ہیں۔ جلیل کی طرح کچھ ہی کم لوگ ہیں جن کے کام کبھی ان اداروں نے نہیں چھپوائے اور جو ان کے آگے پیچھے کبھی نہ بھاگے۔

جلیل نہایت شرمیلے اور غیر معروف ہی رہنا چاہتے ہیں یہ بات اس عمل سے آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے کہ جب حکومت پاکستان نے انہیں پرائیڈ آف پرفارمنس کا اعزاز دینا چاہا تو وہ اسے لینے سے ہچکچا رہے تھے۔ میرے کہنے پر انہوں نے اتنی مہربانی کی کہ انکار نہ کیا۔ اور یہ جرم میں اپنے سر لیتا ہوں کہ انہوں نے ایوارڈ لینا مان لیا تھا۔ مگر وہ لینے کے لئے گئے نہیں۔

وہ پیدائشی ادیب ہیں۔ سیکھ کر اور متاثر ہو کر نہیں لکھتے۔ وہ اپنے دل و دماغ سے اپنے مخصوص پیرائے میں لکھتے ہیں اور پڑھنے والوں کو اپنا گرویدہ بنا لیتے ہیں۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں تبدیلی آتی نہیں۔ ہم اب بھی سراب کی پیچھے بھاگتے ہیں اور نہ آسودہ امیدیں اور خواب لے کر جیتے ہیں۔ ادیب اور شاعر ہمیں یقین دلاتے ہیں کہ عمل نہ چھوڑیں اور ہم مایوسیوں کو چھوڑ کر جینے لگتے ہیں کہ جلیل کہتے ہیں کہ ''یہ بھی گزر جائے گا۔'' جو اپنے پورے سچ سے لکھتے ہی وجود کی ساری سچائیوں کے ساتھ دکھ بانٹتے ہیں۔

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے ریٹائر ہونے پر حکومت سندھ نے انہیں سندھی لینگویج اتھارٹی کی چیئرمین کا عہدہ پیش کیا جسے وہ لینے سے ہچکچا رہے تھے کہ میں ماہر لسانیات نہیں۔ میں نے انہیں مجبور کیا کہ وہ مان جائیں چارج لیں اور تین مہینے کی چھٹی لے کر آئیں۔ مگر کچھ ادیبوں نے انہیں آرام سے رہنے نہ دیا۔ پریس میں متعصب پروپیگنڈا شروع ہوا اور جلیل نے جھٹ سے استعفیٰ دے دیا۔ میں تو ایسے ایک شخص کو بھی نہیں جانتا سوائے حیدر بخش جتوئی کے جس نے اتنے بڑے عہدے سے اپنی مرضی سے استعفیٰ دیا ہو۔ جتوئی صاحب کی تو اپنی خاندانی زمینیں اور جائیداد تھی مگر جلیل کے پاس تو بس ایک قلم ہی ہے۔ آج ہمارے ہاں متعلق شعبہ کلچر کی وزیر موجود ہیں اور بھی بہت صاحب اختیار لوگ موجود ہیں جو آپ کو بتائیں گے کہ جلیل کتنے بڑے قلم کار ہیں

اوران کے کام نے سندھی ادب میں کتنا بھرپور کردار ادا کیا ہے۔ مگر کسی میں بھی اتنی آگہی نہیں کہ انہیں سندھی ادبی بورڈ یا سندھی لینگویج اتھارٹی کا کوئی عہدہ دے دیں۔ جب کہ سب جانتے ہیں کہ آج سندھی تمدن اور زبان، تاریخ اور ادب زوال پذیر ہو رہے ہیں اور ہمیں اسے بچانے کے لئے زبانی جمع خرچ سے زیادہ عملی اقدامات کرنے ہوں گے۔ ایسے ذہین اور دردمند صاحب فن وفکر کی ضرورت ہے۔ یونیورسٹی میں تخلیقی ادارے ہونے چاہئیں جو تخلیق کرنے والوں کو وظائف اور حوصلہ بخشیں تو جلیل جیسے لوگ ہی ہماری رہنمائی کر سکتے ہیں۔ ہمیں ایک دوسرے کی مدد کی ضرورت ہے۔ جلیل جیسے لوگ ہی ہمیں انتہائی یاس اور مایوسی کی فضائے نکل کر امید بہار بن کر آسکتے ہیں۔

غلام محمد گرامی

امر جلیل کا فن اس دور کے معاصر فنکاروں میں انفرادی اسلوب کا حامل ہے جو اپنا ایک مخصوص تاثر چھوڑ جاتا ہے۔ جسے محسوس تو کیا جا سکتا ہے مگر بیان نہیں کیا جا سکتا امر جلیل نے جو کچھ بھی لکھا ہے وہ افسانہ نگاری کے فن کی اعلیٰ مثال ہے۔

نسیم احمد کھرل

امر جلیل نے سب کے بعد لکھنا شروع کیا مگر طوفان کی طرح سب پر چھا گیا اور باقی سب کو تنکوں کی مانند اڑا دیا۔ اس کو سب پہچاننے لگے ہیں اور دوسروں کو کوئی پوچھتا بھی نہیں وہ ابھی زندہ ہے تو اس پر نمبر نکل رہے ہیں دوسرے رگڑ رگڑ کر مر گئے کوئی کتا بھی نہ بھونکا۔ ریڈیو کھولو جلیل، ٹی وی کھولو جلیل، شامیں سجائی ہیں تو جلیل کے ساتھ۔ لوگ مہینوں کی مشقت سے کوئی کہانی تحریر کر پاتے ہیں جلیل کو مٹکے میں ہاتھ ڈالنا ہے اور کہانی حاضر۔ بس جسے پیا بھائے وہی سہاگن ہے۔

زیب بھٹی

امر جلیل کا آج کے افسانوی ادب میں کوئی جواب نہیں۔ اس کے قلم سے نکلی ہوئی ہر سطر تیز

دھار کے ساتھ امرت دھار بھی ہے۔اس کی کہانیوں میں جو زہر ہے اتنا ہی شہد بھی ہے۔طنز ومزاح میں لکھنے کا اس کا انداز کبھی کبھی رلا دیتا ہے۔ہمیں امر جلیل سے بھی اتنا ہی پیار ہے جتنا ہم اس کے افسانوں کو چاہتے ہیں۔میں اس کے قلم کی طاقت کو سلام کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

ڈاکٹر غلام علی الانا

امر جلیل اعلیٰ پایہ کے فنکاروں میں سے ایک ہیں۔اس کی طرز تحریر انوکھی ہے۔وہ اپنے فن کو محض تفریح کے لیے نہیں استعمال کرتا بلکہ سماجی المیہ کا نقاش ہے جس میں سماج کی سچی تصویر نظر آتی ہے۔تو وہ ایک حقیقت نگار ہے۔جیسے ایک کہانی میں رقم طراز ہے''انسان ازل سے دولت کا غلام ہے اور دولت دیوتاؤں سے زیادہ طاقتور ہے۔''

شمشیر الحیدری

اس کے افسانوں میں خالص انسانی قدروں کی نمائندگی ، جذبات اور احساسات کی اصلیت اور انسانی نفسیات کا بھرپور مطالعہ ملتا ہے۔فکر کی گہرائی ،سماجی مسائل کا علم اور ان کے حل، فنکارانہ مہارت سے لکھی ہوئی سلیس زبان میں یہ کہانیاں اپنی مثال آپ ہیں۔امر جلیل کے فن کو ایک مضمون میں بیان کرنا آسان کام نہیں۔

پرو فیسر حسن علی عبد الرحمان

میں امر جلیل کی کہانیوں سے متاثر ہوں۔''جب میں نہیں ہوں گا'' کی تمام کہانیاں پڑھیں سراہنے کو الفاظ نہیں ملتے۔سچ تو یہ ہے کہ امر جلیل کی کہانیوں نے ہی سندھی پڑھنے پر اکسایا ہے۔

محمد عثمان ڈیپلائی

سرد لاش کا سفر کہانی پر جو جبر استبداد امر جلیل کو سہنا پڑا جو مصیبت طارق اشرف ایڈیٹر پر آن

پڑی اس برداشت کو سراہتے ہوئے ڈیپلائی صاحب نے لکھا وہ ادیب، شاعر اور ایڈیٹر کیسا جو چوٹ نہ کھائے۔ جو زخم نہ ہو وہ ہمارے قبیلے سے نہیں۔ میں امر جلیل کو مبارک باد دیتا ہوں جسے قدر دانی میں مالی اور ذہنی چوٹ پہنچی اور یہ چوٹ پڑتی رہے گی مگر کسی شاعر کے مطابق ''دکھ کے دن بھی بیت جائیں گے باقی رہ جائیں گی کہانیاں۔'' تو یہ لافانی ہستیاں ہمیشہ قائم رہیں گی اور عوام سے محبتوں کا خراج وصول کرتی رہیں گی بقول حافظ

مادر پیالہ عکس رخ یار دیدہ ایم
اے بے خبر زلذّت شرابِ مدام ما!
ہر گز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما!

تنویر عباسی

ادیب کی عظمت یہی ہے کہ وہ سچ بولتا رہے۔ یہی اس کا المیہ بھی ہے کہ ہر حال میں وہ اس سے باز نہیں آتا۔ امر جلیل سچ ہے۔ یہی ہے اس کی عظمت یہی اس کا المیہ۔ امر جلیل تیرا میرا نہیں سندھ کا افسانہ نویس ہے، ہر انسان کا ترجمان۔

آغا سلیم

ایک دل کی تنہائی پر تاثر۔

اس کہانی میں تیرے اندر کا فنکار جاگ اٹھا ہے روشن آفتاب کی مانند چمک رہا ہے اس قدر شعریت، میٹھی کڑواہٹ اتنی غمگین نغمگی، کیسے لکھی ہے تو نے یہ کہانی''؟ دل کرتا ہے کاش یہ کہانی میں نے لکھی ہوتی! کیونکہ یہ ازلی عذاب جس میں درد کا سمندر مچل رہا ہے میرا ہی عذاب ہے۔ قہقہے اور آنسو تو وہی لہریں ہیں جو بے چین روح سے اٹھ کر ہونٹوں پہ آتی ہیں اور پھر واپس بحرِ بیکراں کی طرف مڑ جاتی ہیں۔

نانک مدنانی ، دهلی

راهون جدا جدا کہانی Homo Sexuality پر لکھی گئی ایک دلچسپ کہانی ہے سندھی میں اس موضوع پر پہلے کوئی کہانی نہیں شائع ہوئی۔ انتظار کی کیفیت کو کہانی میں اس مہارت سے لکھا گیا ہے کہ داد دیئے بغیر رہ نہیں سکتا۔ جس بے باکی سے اس موضوع کو نبھایا گیا ہے وہ کئی چہ مگوئیاں پیدا کرے گا، کئی الزامات لگائے گا مگر میری نظر میں یہ کہانی جدت پسندوں کو بہت پسند آئے گی۔

امداد حسینی

مجھے وہ شام اچھی طرح یاد ہے جب جلیل پاکستان سینٹر حیدرآباد سندھ میں اپنی ایک انگریزی کہانی ''Son of the Soil'' انگریزی کہانیوں کی شام میں پڑھ رہا تھا۔ صدارت اسلم اظہر ڈائریکٹر پاکستان ٹیلی وژن کراچی، کرر ہے تھے۔ کہانیاں سنتے وہ بڑے قہقہے لگا کر ہنس رہے تھے اور تمام سننے والے بھی ہنس ہنس کر تھک گئے تھے مگر جلیل فقط مسکرا رہا تھا۔ بس ایک دفعہ وہ قہقہ لگا سکے جس میں اس کے اندر کا پورا درد اُمڈ آیا تھا وہ مجھے اس کے روح کی چیخ سی لگی تھی۔ جلیل جب چپ ہوتا ہے تو اس کے اندر کا سمندر خشک ہونے لگتا ہے وہ اس خشک سمندر پر کھویا کھویا سا بالکل تنہا تنہا، ایک دم اکیلا ہی کھڑا رہتا ہے۔ مگر میں جانتا ہوں سندھی زبان کا یہ انوکھا کہانی کار، کہانی لکھنا کبھی بند نہیں کر سکتا کیونکہ کہانی ہی اس کی زندگی اور موت ہے۔

محمد بخش سميجو

امر جلیل کا مضمون ''مان پيحان مان پُران'' واقعی امر جلیل کی ہمہ گیر شخصیت کا پتہ دیتا ہے۔ ان کی معلومات یہ ثبوت دے رہی ہے کہ وہ حقیقتاً اس زمین کے سچے بیٹے ہیں، امر ہیں۔ مجھے ان کے متعلق کچھ رقم کرنا بڑا مشکل لگ رہا ہے۔ ہمارے لیے جلیل ایک جلیل القدر ہستی بن گئے ہیں۔ میرے دل میں جن لوگوں کے لیے محبت کا بحر بے کراں ہے تو ان میں امر جلیل کی شخصیت بھی نمایاں ہے۔

سلطانہ وقاصی

''سردلاش کا سفر'' کہانی پر لمبا تجزیہ کرتے ہوئے یوں اختتام پذیر ہوتی ہیں۔

آپ نے سچ لکھا ہے کہ مذہب مر چکا ہے۔لوگ اس کی لاش لیکر چلتے ہیں۔اس کے نام پر لوگوں کو لوٹا جاتا ہے، مارا مروایا جاتا ہے پتہ نہیں کب تک یہ سلسلہ چلے گا۔اس دور میں لوگ اگر انسانیت کو اس کہانی کی طرح سوچیں تو کتنا اچھا ہو کہ مذہب دھرتی ، ایمان انسانیت اور عقیدہ خدمت بن جائے۔

نسیم احمد کھرل

''منھنجو دوست منھنجو دشمن'' ایک عام رواجی کہانی ہے۔کارخانوں کے تمام مزدور ایسے ہی کرتے ہیں جیسے مکرانی نے کیا۔ان کے جوابات بھی وہی ہیں جو مزدور لیڈر مالکوں کو دیتے ہیں۔امر جلیل نے کیا نئی بات کہنی چاہی ہے اور مکرانی نے آخر کیا نیا کام کیا ہے؟

رسول بخش پلیجو

''اکثر اوقات یہ لگتا ہے کہ امر جلیل کے ہاتھوں سے جذبات اور احساسات کے گھوڑے کی لگام بار بار نکل جاتی ہے اور فن پارے کی عظمت کے لیے جو تحمل اور جس غیر جانبداری کی ضرورت ہوتی ہے وہ اس کو برقرار نہیں رکھ پاتا۔وہ ہر قدم پر نعرے لگاتا ہوا متعین کی ہوئی منزل کی جانب رواں دواں ہے۔ایک مبلغ اور اعلیٰ فنکار کا مقصد تو ایک ہی ہوتا ہے دونوں کسی بات کے حامی یا مخالف ہوتے ہیں اور دونوں کا مقصد جذبات کی شدت دوسروں کے دلوں میں پیدا کرنا ہوتا ہے ۔ہاں ذرائع بالکل جدا جدا ہیں۔مبلغ اپنی بات بڑی شدومد سے، اعلیٰ الاعلان دوٹوک الفاظ میں بیان کر دیتا ہے جب کہ فنکار اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا۔نہ نصیحت کرتا ہے نہ مشورہ دیتا ہے اور اپنی طرف سے کوئی تبصرہ یا تنقید نہیں کرتا، کسی طرح جانبدار نہیں بنتا۔اب اس کے کمال فن پر منحصر

ہے کہ پڑھنے والا وہ احساسات اپنے اندر اجاگر ہوتے ہوئے محسوس کرے جو فنکار چاہتا ہے۔ یہی اس کی آزمائش اور امتحان ہے امر جلیل کی یہی بڑی کمزوری ہے کہ وہ اکثر ایک مبلغ اور ایک فنکار کے فرق کو قائم نہیں رکھ پاتا ورنہ ''اروڑ جو مست'' اور ''ھن جار ہر'' جیسی کہانیاں گواہ ہیں کہ وہ اعلیٰ پایہ کا کہانی کار ہے۔ اس کی ایک اور کہانی سراب (ر چ) میں جو منظر ابھرتا ہے کہ دو ساتھی ٹیچرز گلے میں باہیں ڈال کر گاتے ہیں۔

مالک تم درد دفع کرو گے ۔ نہیں چھوڑو گے
ہر حال میں ہر جگہ رہبر بنو گے ۔ نہیں چھوڑو گے

یہ نظارہ اب تک آنکھوں کے سامنے گھومتا ہے۔ کون ہے جسے اس خارجی ہنسی مذاق کے پیچھے اس درد کے نشتر نہ چبھتے ہوں یا محروم اور مایوس دلوں کے درد اُسے نہ رلاتے ہوں۔ ان کی ایک اور کہانی ''محبت ,آرزوءِ دل جي دنيا'' ایک نہایت ہی اثر انگیز کہانی ہے، ایک بہت ہی پیاری کہانی جس میں دیہی زندگی کی سچی تصویر نظر آتی ہے۔ سچ یہ بھی ہے کہ اصل زندگی اور زندگی کے مسائل تو کوئی ان لوگوں کے دیکھے، دیکھ کر دنگ رہ جائے۔ زندگی کی حقیقی جاگتی تصویر تو پوری آب وتاب سے دیہات میں ہی دکھائی دیتی ہے۔ اصل زبان اور اس کا خالص پتا بھی یہیں ملتا ہے ہم پڑھے لکھے جاہلوں کو زبان کا کیا علم! ہماری خالص شاعری تیکھا سونا ہے جو عوامی شاعری کہلاتی ہے، لوک گیتوں کی زبان ہی اصل سندھی ہے۔ ہمیں تو اس خزانے سے ایک تولہ بھی ہتھے نہیں لگا۔ وہ زبان جو دیہی علاقاجات تھر، کاچھے، لاڑ اور سرے کے شادی سہروں، رسموں، کہاوتوں اور شادی کے روایتی الفاظ اور فساد جھگڑے کے غصیلے جملے، روٹھنے اور منانے کے مخصوص الفاظ ہی اصل ورثہ ہیں اس زبان کا جو صرف دیہات میں لوگوں میں زبان زد عام ہیں۔

روزمرہ استعمال کی وہ زبان جو اصل حالت میں ایک عظیم اور امر سرمایہ ہے جو صدیوں کی ذہانت اور دانش کا پیش خیمہ ہے ہماری سدا بہار زبان ہے جس سے ہمارے لکھنے والوں کو سیکھنا ہے کہ یہاں کی اپاہج حالت سدھرے جیسے اسکاٹ لینڈ کے پہاڑی علاقائی زبان سے سر والٹر

اسکاٹ کے لاثانی شاہکار تخلیق ہوئے ہیں۔ اگر یہ جاہلانہ کا کنی انگریزی زبان سے ڈکنس کے شاہکار تخلیق ہوئے ہیں۔

اس طرح مارک ٹوین، ہیمنگوی، گورکی، کالڈ ویل، ٹینیسن اور ولیمس جیسے شہرۂ آفاق ادیب اپنے وطن کے لوگوں کی عام زبان سے یہ لافانی کتب رقم کر سکتے ہیں۔ تو پھر وادی سندھ کے ادیب آج شاہ لطیف اور سچل سرمست کے ورثے سے کیوں نہیں مستفید ہو سکتے؟

هدایت پریم

امر جلیل ہمارا ارنیسٹ ہیمنگوے ہے مگر پتہ نہیں کیوں کچھ کہانیوں میں Demolarization کا تاثر ابھر کر آتا ہے جیسے ''جب میں نہیں ہوں گا'' کہانی میں ایک غیر لڑکی سے ہیرو کا پیار کرنا عجیب سا احساس پیدا کر دیتا ہے ویسے کہانی بہت ہی شاندار ہے۔

''نہ ویج نہ طبیب'' کا عنوان بھی تعجب انگیز ہے کہانی کے اس تھیم Theme کو لاعلاج مرض گنوانا اچھا نہیں لگتا جس کا نہ کوئی ویدا اور نہ طبیب ہو۔ باقی ان کی کہانی ہر موڑ پر ہنساتی ہے، پُر لطف کر دیتی ہے خاص طور پر ''بابا'' کے کردار کے انگریزی مکالموں نے بہت محظوظ کیا۔

لچھمن کومل بھاٹیہ

امر جلیل میرا دوست

(اپنے ایک دوست کی نظر میں)

سندھ آنے کے لئے ویزا اور کراچی کے لئے جہاز کے کنفرم ٹکٹ لے کر، اس رات میں نے اپنے دوست سلیم میمن کو فون کیا۔ سلیم صاحب نے کہا: امر جلیل کی گولڈن جوبلی کی تقریب کے لئے جلیل پر تفصیلی مقالہ لکھ آؤ۔ میں نے کہا: دلبر، امر جلیل پر تفصیلی اور مکمل مقالہ لکھنے کے لئے میری یہ عمر ناکافی ہے اور اب تو آگے چل کے اگر میرے قلم نے جرأت اور جسارت کی تو امر جلیل

کی ڈائمنڈ جوبلی کے موقع پر، بشرطِ زندگی، اپنی پوری معلومات یکجا کر کے لکھ آؤں گا۔

امر جلیل مجھ سے کہتے ہیں: 'کومل، پچھلے جنم میں ہم بھائی تو نہیں تھے؟' اور میں کہتا ہوں: 'امر ہم اس جنم میں بھی بھائی ہیں۔ صرف دو ملکوں میں بٹ گئے ہیں۔ میرے ہندو ہونے یا مسلمان ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں ہندو اس لئے ہوں کہ کنڈیارو شہر کے ایک ہندو گھرانے میں پیدا ہوا۔ اگر روہڑی کے خان صاحب قاضی عبدالغنی کے گھر میں میری پیدائش ہوتی تو میں مسلمان ہوتا اور امر جلیل کا 'سگا' بھائی ہوتا۔

یہ کوئی معجزہ نہیں ہے، نہ ہی عجیب اتفاق ہے ہماری زندگی کی کسی ابھرتی رمہکتی صبح کی طرح ایک روشن حقیقت ہے کہ انتخاب کا حق نہ ہونے کے باوجود امر اور میں ایک ہی سال پیدا ہوئے ہیں۔ (کیوں پیدا ہوئے ہیں یہ ایک الگ سوال ہے، جو ہم دونوں آج تک خود اپنے آپ سے پوچھتے رہتے ہیں)۔ فرق صرف اتنا ہے کہ امر جلیل کا دنیا میں آنا امرِ جلیل (خدا کا حکم) تھا اور میرا ظہور اس دھرتی پر ایک گنہگار کا اضافہ تھا۔ تعلیم کے کئی سال ہم دونوں نے نوابشاہ میں گزارے ہیں۔ ہم دونوں کی شادی خانہ آبادی ایک ہی مہینے اور ایک ہی سال ہوئی ہے۔ دونوں کی اپنی پسند اور محبت کی شادی تھی۔ پیدائش اور مرنے کے حق انتخاب ہمارے ہاتھ میں نہ ہوتے ہوئے بھی، درمیانی عرصے میں ہم مختلف معاملات میں حق انتخاب کا استعمال کر پائے ہیں۔

علم، ادب، میڈیا، مواصلات، نشریات اور صحافت کو ہم دونوں نے اپنا پیشہ چُنا ہے، امر برسہا برس سے سندھی، اردو اور انگریزی اخبارات کے لئے روزانہ اور ہفتہ وار کالم لکھتا رہا ہے اور میں اپنی ہی ملازمت کے دوران اپنے ہی اخبار کے لئے ہفتے کے پانچ دن ایک ہی کالم "City Notes" لکھتا رہا۔ پر ہم دونوں کے رُخ اور رویئے میں بڑا فرق رہا۔ امر کے کالموں کی نوعیت خالص ادبی اور علمی تھی۔ اور میرے کالم محض تجارتی تھے۔ جو کہ میں روزی روٹی کھانے کے لئے اپنے آجروں کی مرضی کے مطابق لکھے۔

کبھی کوئی ایڈیٹوریل بھی لکھنا پڑا تو وہ ایڈیٹوریل کم اور پروپرائیٹوریل (Proprietorial)

زیادہ ہوتا تھا۔ جرنلزم میرے لئے ملازمت تھی پر امر کے لئے وہ عبادت تھی۔

سلیم صاحب نے جب مجھے امر کی شخصیت پر خاکہ لکھنے کے لئے اپنے قصرِ ایوان سے حکم صادر کیا تو سب سے پہلے میں نے ٹھنڈے پانی کا گلاس پیا۔ امر پرہیزگار ہے اور مجھے اپنے دوست کی پرہیزگاری کا مکمل احترام کرنا تھا۔ اس لئے جب تک امر پر آخری لائین لکھ کر پوری نہیں کر لیتا ،اس وقت تک حرام چیز کو ہاتھ نہیں لگاؤنگا۔

گوپی (میری زوجہ) نے آہستہ سے کمرے کا دروازہ کھول کر پوچھا: 'کیوں طبیعت تو ٹھیک ہے؟' میں نے کہا: 'صرف ٹھیک ہی نہیں بحال اور باغ و بہار ہے۔' امر جلیل پر کچھ لکھ رہا ہوں۔ پچاس سال پورے ہونے پر سندھی کہانی بڑی الجھن میں آ گئی ہے۔ وہ مجھے حیرت سے دیکھ کر دروازہ بند کر کے چلی گئی۔

اس وقت میرے سامنے امر جلیل کی کہانیوں کے چھ مجموعے اور ایک ناول نیٹ گونگي ڳالهايو (بلآخر گونگا بول اٹھا) اور تقریباً درجن برابر خطوط رکھے ہیں۔ جو کہ میں نے اپنے پرانے بریف کیس میں سنبھال کر رکھے ہیں۔ امر کی کہانیوں کو میں نے کئی مرتبہ اور خطوط بار بار کھول کر پڑھے ہیں۔ امر کی کہانیوں کے کئی کرداروں نے میرے ذہن پر اپنا عکس چھوڑا ہے، پر ان کے خطوط کی ہر ایک لائن نے مجھے ایک عجیب خوشبو سے ہمیشہ معطر رکھا ہے۔

اختر شیرانی کا ایک شعر ہے:

مٹ گئے اپنی امیدوں کی طرح حرف ، مگر
آج تک تیرے خطوں سے تیری خوشبو نہ گئی

سانسوں کے ساتھ سنبھال کر رکھا ہوا یہ سرمایہ اگر کبھی مجھ سے گم ہو گیا تو میں اپنا حافظہ کھو بیٹھوں گا۔ امر کے ایک خط کے لفافے پر میں نے ایک لائن لکھ دی ہے "ہم نے تو مر مر کر کوئی اندازِ حسن پیدا کیا ہے۔ یار امر تمہیں تو وہ گھر بیٹھے ہی مل گیا ہے"۔

شاید سن چھیاسٹھ، سڑسٹھ (۶۷ء، ۶۶ء) کی بات ہے جب،، ہریکانت اور میں نے مل کر دہلی

کے حوض خاص علاقے میں سندھو بھارتی آرٹ پرنٹرس نامی سندھی کی پرنٹنگ پریس شروع کی اور وہاں سے 'آکاٹي' (کہانی) نامی صرف کہانیوں کا ماہانہ میگزین جاری کیا۔ پریس میں کبھی کبھی نارائن شیام بھی اپنے آفس سے فارغ ہوکر آکر بیٹھتے تھے۔ایک شام جب میں پریس آیا تو نارائن شیام بہت توجہ اور دلچسپی سے میگزین کے لئے آئی ہوئی ایک کہانی پڑھ رہے تھے۔کہانی امر جلیل کی 'ڌرتي جي ڏوڙ آسمان جا تارا' (دھرتی کی دھول، آسمان کے تارے) کے عنوان سے تھی۔ کہانی میں ایک جگہ آکر نارائن شیام کی آنکھیں اٹک گئیں۔'آخر کار شاہو نیچے کی طرف جھکا اور بچی کو گود میں اٹھالیا۔ بچی کو ایک بازو سے پکڑ کر، دائیں ہاتھ سے تمنچا نکال کر بچی کے اوپر تان لیا۔ بچی کا منہ اتنا دور بھی نہیں تھا کہ وہ اسے دیکھ ہی نہ پاتا۔اس نے گھور کے دیکھا اور پھر ریوالور کی نالی روتی ہوئی بچی کے منہ میں ڈال دی۔اچانک بچی کے رونے کی آواز بند ہوگئی، بچی ریوالور کا سرد لوہا چوسنے لگی۔شاہو کی انگلی ٹرگر پر ساکت ہوگئی، آندھی مٹی کے بادل اٹھا کر آسمان کی جانب پرواز کرنے لگی۔پیپل کے سوکھے ہوئے پتے پرانے گھر کے برآمدے میں تڑپتے ہوئے اڑنے لگے۔

کہانی کی یہ سطور پڑھ کر نارائن بہت بے تاب ہوگیا تھا۔اس نے کہانی مجھے پڑھنے کو دی۔ مجھے یاد آیا کہ امر نے یہ کہانی پہلے ضمیر واحد متکلم میں لکھی تھی۔لیکن پھر کہانی میں کسی کوتاہی کا احساس ہونے پر اس نے وہ کہانی دوبارہ تھرڈ پرسن شاہو کے کردار میں ڈھال کر نئے انداز میں لکھی تھی۔دوبارہ نئے سرے سے لکھی ہوئی کہانی زیادہ جاذب اور جاندار ہوگئی تھی۔

کہانی پڑھ کر میں نے امر کو صالح بلاول اسٹریٹ حیدرآباد والے پتے پر ایک لائن کا خط لکھا، 'سندھی کہانی کے ایک باذوق پُروقار امر جلیل کو ہزاروں سلام'۔'کومل'

جلیل نے سمجھا 'کومل' کسی نازک، نفیس اور جوان لڑکی کا نام ہے، اس نے یہی سمجھ کر مجھے ایک رومانوی خط لکھا۔اس رومانوی خط کے جواب میں، میں نے امر کو اپنی تصویر بھیجی۔اور پھر اس نے اپنے خط کتابت والی تحریر کا انداز اور رویہ بدل دیا اور اس طرح ہمارا خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا برسہا برس تک اور ہماری روحوں کے رشتے جڑنے لگے۔

امر نے ایک بار ایک خط میں لکھا: 'جس سے بہت زیادہ پیار ہو جائے اس سے ملنا جلنا چھوڑ دینا چاہیے۔' اور میں اس کی اس خواہش کا احترام کرتے ہوئے پچیس برس تک ان سے نہیں ملا۔ باوجود اس حقیقت کے کہ اس عرصے میں پانچ مرتبہ میں پاکستان آیا تھا۔ اور اسلام آباد میں اس سے کچھ میلوں کے فاصلے پر رہ رہا تھا۔ ستر کی دہائی میں، سخت مارشل لا کے دور میں امر مجھے لاہور لینے کے لئے آ رہا تھا کہ اس پر شہر کی حدود پار نہ کرنے کی پابندی لگائی گئی۔

اپنے اندر اٹھتے ہوئے طوفان کو کاغذ اور قلم کا سہارا دے کر امر نے مجھے خط میں لکھا کہ، ''ہم مل نہیں سکے اس میں اس کی اپنی کوتاہی اور کمزوری ہے، اس نے اعتراف کیا ہے کہ وہ (بھیڑیوں) سے ڈرتا ہے۔''

اس دوران وقت بہت آگے نکل آیا۔ ان برسوں میں سندھو کے پُل کے نیچے سے کافی پانی بہہ گیا اور اب وہ سوکھ چکا ہے۔ انتظار کے مرحلے پار کر کے ہم مایوسی سے آس تک آ گئے اور پچیس برس بعد ہم ملے تو دونوں ہی جوانی کی منزلیں پار کر چکے تھے بلکہ یہ کہنا بھی غلط ہو گا کہ ہم دونوں بڑھاپے کی منزلیں بھی پار کرنے والے تھے۔

2003ء کے موسم سرما میں جب امر پہلی مرتبہ مجھ سے بغل گیر ہوا تو اس کی قوت اشتیاق سے مجھ کمزور کی ہڈیاں چٹخنے سے بال بال بچیں۔ میری آواز بھاری ہو چکی تھی۔ دستوری ریٹائرمنٹ لینے کے باوجود امر ریٹائر نہیں ہوا تھا۔ اس کی صحت، صحبت دونوں اچھی تھیں۔ اور میری صرف صحبت اچھی تھی صحت خراب ہو چکی تھی۔ مجھے چھ سیڑھیاں چڑھنے میں بھی کافی دشواری کا سامنا کرنا پڑتا تھا، پر امر چھ منزلیں بھی ایک ہی سانس میں بغیر رُکے ہی چڑھ جاتا تھا۔

میرے سامنے امر جلیل کی کہانیوں کے پانچ مجموعے جن میں امر کی پچپن (۵۵) کہانیاں شامل ہیں۔ اور 'سنڌو منهنجي ساهه ۾' (سندھو میری سانس میں) اور منتخب کردہ ستتر (۷۷) مختصر کہانیاں اور اخباری کالم شامل ہیں۔ میں نے یہ سب کہانیاں اور کالم بار بار پڑھے ہیں۔ ایک ایک کہانی پر لکھنے کے لئے میرے پاس وقت ہی نہیں بچا ہے۔ میں نے جوانی میں ہندوستان کے

ایک مشہور رسالے 'السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا' کے لئے امر کی ایک کہانی "A House on Barness Street" کا انگریزی میں ترجمہ کیا تھا اور 'آج کل' کے 'سندھی ادب نمبر' کے لئے 'پرندہ' نامی افسانے (پکي) کا ترجمہ اردو میں کیا تھا۔

ایشیاء کے سب سے بڑے اشاعتی ادارے سے ساہتی اکیڈمی کی طرف سے شائع ہونے والے انگریزی اور اردو مجموعوں 'پاکستانی کہانیاں' میں امر کی کہانی 'تاريخ جو ڪفن' (تاریخ کا کفن) کو بہترین کہانی کے طور پر مانا گیا اور 'کتھا' ادارے نے امر کی کہانی "The Bird" کو جنوبی ایشیائی کہانیوں میں اول نمبر کہانی کا انعام دیا تھا۔

میرے خیال میں Pedrocity امرد پرستی جیسے عنوان پر 'راهون جدا جدا' (راہیں الگ الگ) جیسی شاہکار کہانی برصغیر کی کسی دوسری زبان میں نہیں لکھی گئی۔ مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ میں امر کو مشکل میں ڈالنے والی کہانی 'سرد لاش جو سفر' (سرد لاش کا سفر) پڑھنے سے محروم رہ گیا ہوں۔

میں یہ بات بغیر کسی رکھ رکھاؤ کے کہہ رہا ہوں کہ جس وقت سندھی کہانی تیل کے قطروں کی مانند، پانی کی سطح پر اوپر ہی اوپر تیر رہی تھی، اس وقت امر جلیل نے ہی اس کو گہرائیوں میں اتارا۔ جس وقت سندھی کہانی کے اندھے کردار اپنے کہانی نگار کو ہی آنکھیں دکھا رہے تھے۔ اس وقت امر جلیل نے اپنے کرداروں کو خوابوں میں بھی نیا نور بخشا۔

اس وقت ہم دونوں باہتر (۷۲) برس کے ہو چکے ہیں۔ میری زندگی کا پھل جھڑ چکا ہے اور صرف سوکھی ٹہنیاں ہی ٹہنیاں رہ گئی ہیں اور امر جلیل ابھی تک ادب کے اس تناور درخت کی طرح ہے جس میں پھل پک جانے کے بعد بھی نہ گرتا ہے اور نہ ضائع ہوتا ہے۔

(امر جلیل کے تحاریر کے گولڈن جوبلی کے موقع پر جامعہ کراچی کی شاہ عبداللطیف بھٹائی چیئر کی جانب سے منعقد ہونے والی تقریب میں مورخہ 28 جون 2008ء کو پڑھا گیا۔)

سندھی ادب کا دیو قامت ادیب امر جلیل

(میں نے یہ تقریر 29 جون 2008ء کو 50 سالہ گولڈن جوبلی تقریبات میں انگریزی زبان میں کی جسے کراچی یونیورسٹی نے امر جلیل کے اعزاز میں ریجنٹ پلازا میں منعقد کیا۔ ناگپال)

''محبت کی راہوں میں انسان کو دائمی درد ہی حاصل ہوتا ہے''

(امر جلیل)

یہ نام ان بڑے ناموں کی صف میں شامل کیا جا سکتا ہے جو بڑے کہانی گو اور قد آور مصنف سمجھے جاتے ہیں جو اپنے پڑھنے والوں کو مزاح اور خوشی بیک وقت فراہم کرتے ہیں۔ ان کی طلسماتی شخصیت معصوم بچوں کو بھی متاثر کرتی ہے وہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ ایک ایسا معصوم بچہ ہے جو عمر کے مراحل تو طے کر چکا ہے۔ بالغ ہو گیا ہے لیکن اس میں آج بھی وہ معصومیت اور بچپن موجود ہے۔ ذاتی طور پر میں ان کی ذات میں جن خصوصیات کا قدر دان ہوں وہ ان کی بچوں کی سی معصومیت، سچائی، قوتِ تخلیق اور جدت پسندی ہے۔ اگر کبھی آپ کی قسمت یاوری کرے اور آپ کو چند گھنٹے ان کی متاثر کن صحبت میں گزارنے کا خوشگوار تجربہ حاصل ہو تو آپ کو معلوم ہو گا کہ وہ اپنی زندگی میں کس قدر سادہ سچا اور کھرا آدمی ہے۔ بے غرض اور نمود و نمائش سے پاک منکسر المزاج۔ جو کچھ بھی اسے زندگی میں حاصل ہوا اس پر اس نے کبھی فخر نہیں کیا۔ میں نے ہمیشہ دیکھا کہ وہ اپنے چاہنے والوں سے اتنی محبت، خلوص اور گرم جوشی سے ملتے ہیں کہ یہ شک ہونے لگتا ہے کہ وہ ان کے دیوانے ہیں یا یہ ان کا۔ وہ ہمیشہ دل کی گہرائیوں سے، انکساری سے دونوں ہاتھ جوڑ کر نرم لہجے میں گفتگو کرتے ہیں۔ الفاظ کے چناؤ میں بے حد محتاط، مہذب اور اخلاق کا نمونہ ہیں۔

ان کی کہانیاں، کالم، ڈرامے اور ناول ان کی مہارت اور برتری کا سبب ہیں اور وجہِ شہرت ہیں۔ انہیں ہمیشہ اور ہر وقت سب نے پیار دیا۔ ہر دل کی چاہت ہیں۔ ساتھ ہی دلچسپ اور پُر لطف بھی۔ لوگ منتظر رہتے ہیں ان کی کوئی تحریر کسی ادبی میگزین، اخبار، ماہانہ یا ہفتہ وار رسالے میں

پڑھنے کے لیے مل سکے۔ کتاب کی فروخت کے لیے ان کا نام سند سمجھا جاتا ہے۔ ان کے موضوعات حقیقت سے قریب تر ہیں۔ اور سندھ کے مظلوم اور کچلے ہوئے طبقے کے ترجمان ہیں۔ وہ معاشرتی مسائل پر قلم اٹھاتے ہیں جو مذہب ذات پات کے المیہ پہلوؤں کی عکاس ہیں۔ جہاں حاکم خدائی کا دعویدار اور غریبوں کی تقدیر کا مالک ہوتا ہے۔ ان کی کہانیوں کے موضوعات سندھ کی دھرتی کے المیوں اور دکھوں کے اِرد گرد گھومتی ہیں۔ کبھی کبھی وہ بے حد تلخ ہو جاتے ہیں اور اعلانیہ کہتے ہیں کہ ''میں صدیوں کا انتقام ہوں۔ میں سقراط کے ہاتھوں سے زہر کا پیالہ چھین لوں گا۔'' یا پھر ''میں سکندرِ اعظم ہوں اور ظلم و استبدار کی پر درد راہوں کا مسافر ہوں جسے آبِ حیات کی تلاش ہے۔''

ان کی کہانیاں، "سراب"، "سرد لاش جوسفر"، "ڪپيل ٻانهن جو وارث"، "منهنجو پٽ مهدي"، "پل صراط"، "دل جي دنيا"، "جڏهن مان نہ هوندس"، سب کی سب زندگی کی سچائیوں کی عکاس ہیں اور ثابت کرتی ہیں کہ وہ حقیقی معنوں میں اپنی دھرتی کا بیٹا ہے۔ میں یہاں ضرور چاہوں گا کہ امر جلیل کے ہم عصر نقاد اور مشہورِ زمانہ کہانی نویس آغا سلیم کے تاثرات آپ کے سامنے پیش کروں جو برملا کہتے ہیں کہ مجھے تمہاری کہانیاں پسند نہیں، ان کی ایک کہانی سے اس حد تک متاثر ہیں کہ اپنی ایک تحریر کردہ کہانی ''اِک دل کی تنہائی'' میں وہ اپنے اس رشک کے جذبے کو تسلیم کرتے ہوئے کہتے ہیں 'کاش یہ کہانی میں نے لکھی ہوتی' ان کی ایک کہانی ''اروڙ جو مست'' میں انہوں نے سندھی لوگوں کی بدنصیبیوں کو اُجاگر کیا ہے۔ جو ہر قسم کی برائیوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ''سندھ کی دھرتی پر کراماتی پیر ہونا یا ڈاکو ہونا ایک جیسا ہے کہ دونوں ہی کا ایک جیسا کاروبار ہے۔ بہت کم لوگوں کو شاید یہ معلوم ہو کہ امر جلیل نے شاعری بھی کی ہے۔ بے حد خوبصورت آواز پائی ہے اور گاتے بھی ہیں۔ موسیقی کے بڑے دلدادہ ہیں۔ وہ سی ڈیز، ڈی وی ڈیز، کیسٹس اور کمپیوٹر کا بہت ذخیرہ رکھتے ہیں۔ وہ کوئی کہانی تخلیق کرتے ہوئے کلاسیکی موسیقی سنتے ہیں۔ راگ اور راگنیاں ان کی روح میں رچتے بستے ہیں

۔ وہ خوش مزہ اور چٹ پٹے کھانوں کے بھی شوقین ہیں ۔ مثلاً پکوڑے، دہی بھلے، چاٹ، تھالی، کچوری اور اچار وغیرہ کے جبکہ گوشت ناپسند کرتے ہیں۔

وہ کیوں اتنا زیادہ پیار پانے والے اور تعریف حاصل کرنے والے مصنف ہیں؟ اس کی بنیادی وجہ ان کی منفرد سوچ، لفظوں کے انتخاب میں احتیاط برتنے والے، محاوروں کے صحیح اور بروقت استعمال کے ماہر جانے جاتے ہیں۔ ان کی تحریریں، گہرے جذبات اور دلی احساسات سے مرصع ہوتی ہیں کہ پڑھنے والا ان میں کھو جاتا ہے اور ایسا محسوس کرتا ہے جیسے یہ کہانی خود اس کی اپنی کہانی ہے۔ میں چاہوں گا کہ یہاں ان کی کہانی ''منهنجي دل موهن جو دڑو'' کا ایک مکالمہ جو تقریباً تیس سال پہلے میری نظر سے گزرا تھا، کا حوالہ دوں جو آج تک میرے دل و دماغ میں تر و تازہ ہے۔ آپ بھی سنیے اور ان لفظوں کی خوبصورتی کو محسوس کیجیے۔''

''ناز اگر میں مر جاؤں اور موہن جو دڑو میں تبدیل ہو جاؤں تو پانچ ہزار سال بعد بھی لوگ میرے وجود سے تمہاری یادوں کے کھنڈرات کھود کر نکال لیں گے۔''

پیار کی حدود و قیود کا دھرتی کے تہذیب و تمدن سے گہرا ناتا ہوتا ہے۔ سندھ کے باشندوں کی لازوال محبت کے کئی شواہد موجود ہیں جن کے دل محبوب کو اتنے پیار اور گہرائی سے اپنے دل میں مقید رکھتے ہیں کہ اس کی گونج آنے والی صدیوں تک بھی سنی جا سکتی ہے۔ مختصراً مجھے یہ کہنے دیجیے کہ امر جلیل ایک بہترین اور مشہور مصنف ہونے کے ساتھ ساتھ خود پر اوروں کو فوقیت دینے والا، مہذب، شائستہ، ہمدرد اور انسان دوست شخص ہے۔ بقول بالزاک ''ظاہراً زندگی اس کے ساتھ گزاری جاتی ہے جس سے شادی ہوتی ہے لیکن حقیقتاً زندگی جی اس کے ساتھ جاتی ہے جس سے پیار ہوتا ہے۔

یہ قول ہر عاشق کا کتبہ ہے جو جیتے جاگتے ہیں اور اپنے سینوں کے قبرستان میں اپنے محبوب کی یادیں دفن کر کے زندگی بسر کرتے ہیں۔

امر جلیل کا فلسفۂ عشق شاہ لطیف بھٹائی کے بیت میں یوں بیان ہوتا ہے کہ

''میں تجھے ڈھونڈوں، ڈھونڈوں پر کبھی پا نہ سکوں کہ مبادا میرے من کی تشنگی تیری دید سے سیراب ہو جائے'' یا پھر ٹینیسن نے جو کہا کہ 'عشق میں گم ہو جاؤ یا پھر کبھی عشق نہ کرو' ہجر کے صدمے، بیگانگی کے دکھ اور تنہائی محبت کرنے والے کو اپنے محبوب کے قریب ترین کر دیتی ہے جبکہ ملاپ صرف ایک عارضی خوشی اور سطحی لذت فراہم کرتا ہے جو بہت جلد زائل ہو جاتی ہے۔

ان کے کالم 'تیری میری باتیں' سے لے کر 'خبریں' تک ان کی ٹی وی پر بات چیت کے پروگرام خصوصاً KTN اور چینل 5 پر دھرتی ماں کے بدنصیب اور بدقسمت لوگوں کے دکھوں اور تکالیف کی عکاسی کرتے ہیں۔ ڈیلی ڈان کے کالم ان کے قلم کی چبھن کو دھرتی کے ان داتا برداشت نہ کر سکے اور نتیجتاً ان کے عارفانہ کالم چھپنا بند ہو گئے جو بہت ذوق وشوق سے پڑھے اور پسند کیے جاتے ہیں۔

ان کا لکھا ہوا ناول "نیٹ گونگي ڳالهايو" ظلم اور اضطراب کی تاریخ کو بہت تفصیل سے بیان کرتا ہے جو دھرتی کے بیٹوں پر دہشت گردی اور غداری کے الزامات کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ یہ ایک حقیقی اور سچی دستاویزی تحریر کی صورت میں ہمیشہ محفوظ رہے گی۔ ظلم، اذیت، کرب، درد والم جو گونگے ۔۔۔۔۔ پر اس قدر روا رکھا گیا کہ بالآخر گونگا بھی بول پڑا۔۔۔۔ اس ناول نے پڑھنے والوں کو ہلا ڈالا اور ان کے دلوں کو دکھوں سے بھر دیا۔

ان کی تحریروں کا مطالعہ کرنے والا ان کی تحریروں میں اس قدر کھو جاتا ہے کہ ایک ہی نشست میں جب تک مکمل نہ کر لے اس وقت تک نہیں چھوڑتا۔

ان کا خود کا اپنی تحریروں کے لئے کہنا ہے کہ

''مجھے لکھنے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ لیکن اپنے اندرونی خلفشار نے مجھے مجبور کر دیا۔ میرے لیے لکھنا ناگزیر اور واجب ہو گیا۔ اگر مجھے اظہار کا راستہ نہ ملتا تو شاید گھٹن اور حبس سے میں مر جاتا۔''

امر جلیل کے چند یادگار انٹرویوز

انٹرویو نمبر 1

امر جلیل کے سوچنے کا انداز، فکر و فلسفہ اور جینے کا ڈھنگ!

قارئین کی دلچسپی کے لئے ان کا ایک نیا اور اچھوتا انٹرویو، جو ان کی اپنی پسند پر پیش کیا جاتا ہے

رسالہ ''پرک'' (پرکھ) پرچہ اگست 2007ء

ایڈیٹر: نثار منصور

امر جلیل کا پسندیدہ انٹرویو

انٹرویوئر کے ایس ناگپال عنوان ''میں مہاتما بدھ کا بھکشو ہوں''

کچھ بچے بڑے ہو نہیں سکتے، عمر کے نہ رکنے والے چکر میں ان کے قد اور جسم تو بڑھتے رہتے ہیں تجربہ مہارت فن میں تو وہ اعلیٰ مقام کو پہنچ جاتے ہیں علم کے آکاش کو چھو لینے جتنا علم و عرفان رکھتے ہیں مگر محبت، معصومیت، نرملتا اور سم بھاو (سب کو ایک جیسا سمجھنا) اداسی (ویراگ) اور جوگ کی منزل تک جانے والا جس کا من شیشے کی طرح صاف اور شفاف ہے پاک و پویتر دل لئے 71 سال کی عمر گزار دی مگر اب بھی کھلونے اس کو کھینچتے ہیں، ٹوا ءِ شاپ کو دیکھ کر دل للچاتا ہے۔ گھنی داڑھی میں لپٹا چہرہ بچوں سی مسکراہٹ سے کھل اٹھتا ہے۔ آنکھوں میں چمک شرارت امڈ آتی ہے۔ لوگوں کی تعریف توصیف سے بے نیاز، دوشیزہ کے ناز نخرے سے نا آشنا اور دولت کی چمک دمک سے بے بہرہ یہ بیراگی جوگی گوشۂ تنہائی میں کاوش قلم میں الجھا ہوا ہے۔ اگر کبھی مجمعے audience کے ہاتھ لگ گیا اور لوگوں کے پیار سمندر کی زوردار لہریں جب اچھلتی ہیں تو اس کے

نین کٹورے موتیوں سے بھر جاتے ہیں، ہاتھ جوڑ کر سر جھکا لیتا ہے۔

کرکٹ، موسیقی کا پرستار خرد مندوں کی دنیا سے دور سچل کبیر اور میراں سے من بہلاتا رہتا ہے۔ اپنے نظریات میں شدت رکھنے والا کرکٹ کو خیر باد کہہ کر ادب کی پچ پر کئی سینچریاں لگا چکا ہے ہزاروں دلوں کو دیوانہ کر چکا ہے، جیت کر بھی ہارنے والوں کی طرح سر جھکا کر پویلین کی طرف لوٹتا ہے، بغیر اف کیے زندگی کے زہر کو پی لیتا ہے، پھر اُس زہر کو درد بنا کر اس کا قلم اگل دیتا ہے جسے پڑھنے والے عَش عَش کر اٹھتے ہیں۔ ہر ناانصافی، ظلم، تشدد اور بربریت پر الجھنے والا !سخت ردعمل اور احتجاج سے اٹھ کھڑا ہو جاتا ہے، انجام کی پرواہ کیے بغیر برملا وہ سب کچھ کہہ دیتا ہے جسے کہنے کو دوسرے گھنٹوں سوچتے رہتے ہیں۔ ان کا قلم نہ DPR دیکھتا ہے نہ امر جنسی کو! ہر غلط اور قہر پر برس پڑتا ہے جس کے آگے نہ کلاشنکوف ٹھہر سکتی ہے نہ میزائل اسے مار سکتے ہیں۔۔۔ یہ بے ضرر بھکشو، طمع سے لاطمع اپنے نظریات کے لئے جیتا مرتا ہے۔ صوفی جو ہر (ازم)ism، فرق اور فقے سے صاف ہے بس انسانی قدروں کو ہی سوچتا ہے۔ یہ فقر کے بادشاہ بے پرواہ ہوتے ہیں !تو ایسے من موہنے، پیارے اور دلربا شخص سے ملیں، نام جن کا امر جلیل ۔ذات سے قاضی اور کام بھی وہی کرتے ہیں سچ اور جھوٹ پر فیصلہ دینا! آیئے تو اس سے دل کی باتیں کرتے ہیں؛ جو پنیر، برگر چکن سے لاتعلق دال، سبزی، اچار، چاول، دہی بڑے، پاؤ بھاجی اور پکوڑوں کو پسند کرنے والے ہیں۔ جمع کرنے کی ہوس سے بے خبر حساب کے ہندسوں سے انجان ہیں، انا پرستی اور خود پرستی سے کوسوں دور آئینے سے جان چھڑالی ہے، ایک بے پرواہ فقیر ہے آیئے ان سے ملتے ہیں۔

ناگپال: میراں نے کہا ہے ''تم بن جیون کھارو لاگے'' آپ کو جیون کیسا لگتا ہے؟

امر جلیل :اگر میں اس میں تھوڑا اور اضافہ کر دوں تو یہ زندگی تجھ بن جیتا جاگتا جہنم ہے، جیتے تو ہیں پر مر مر کے

ناگپال: آپ نے 70 سال تک اس جیون کے پہاڑ کا سفر کیا ہے۔ کیا سمجھتے ہیں کہ اس سفر کا

کوئی منطقی انجام بھی ہے؟ کوئی مقصد یا کچھ حاصل؟

امر جلیل :عام طور پر لوگوں نے یہ مشہور کر دیا ہے کہ جو بھی انسان اس دنیا میں آتا ہے تو کوئی مقصد لے کر آتا ہے۔ مجھے تو پتہ ہی نہیں کہ میں جب پیدا ہوا تھا تو کونسا مقصد لے کر آیا تھا، کوئی نوٹس لے کر آیا تھا کہ یہ کام کرنا ہے یہ نہیں کرنا، مجھے اس سمت میں کچھ خبر نہیں۔ خوش نصیب وہ بچے ہیں جو جس گھر میں پیدا ہوتے ہیں تو والدین ان کے Brain wash نہیں کرتے، کہ جب بڑے ہوں تو ان کے دماغ میں تل جتنی بھی جگہ خالی نہ ہو۔ عام طور پر ماں باپ بچوں کو اپنی پسند کا نام، مذہب اور نشست و برخاست کے رنگ ڈھنگ، پسند و ناپسند کی تربیت دے دیتے ہیں۔ جب وہ بڑے ہوتے ہیں تو ان میں کچھ کہنے کی طاقت باقی نہیں رہتی۔ بچہ جب ایک مسلمان کے گھر میں پیدا ہوتا ہے تو کان میں اذان دی جاتی ہے، ایک ہندو کے گھر پیدا ہوتا ہے تو کوئی منتر سنا دیا جاتا ہے، عیسائی اسے Baptise کرتے ہیں۔ یہودی کوئی شہد چٹا دیتے ہیں، بچے کو چھوٹی عمر سے باندھ رکھتے ہیں۔ اس حوالے سے میں خوش نصیب ہوں کہ جب میں آٹھ سال کا ہوا تو میرے والد نے یہ محسوس کیا اور میرا برین واش ہونے نہ دیا۔ جب میں NJV اسکول میں پڑھتا تھا تو میرے استاد کو کہہ دیا تھا کہ اگر اسے عربی نہیں آتی تو زبردستی مت کرو اور جب میں دس سال کا ہوا تب انہوں نے مجھے کبھی مجبور نہ کیا کہ ان کے ساتھ مسجد جاؤں۔ وہ خود پانچ وقت کے پکے نمازی تھے۔

ناگپال: روسو نے کہا تھا کہ بچے کو سولہ سال تک اسکول نہ بھیجیں تا کہ اس کی فطری افزائش ہو سکے اور دماغی طور پر وہ بلوغت کو پہنچ پائے اور خود سوچنے کی صلاحیت مضبوط ہو۔ کیا آپ اس کو صحیح سمجھتے ہیں Let mother nature nurture the child

امر جلیل :صحیح کیا یہ تو بچے کا بنیادی حق ہے کہ اسے سوچنے کی آزادی دی جائے۔ اس کے دماغ کو damage نہ کیا جائے۔ سولہ سال تک ہی اس کے اقربا استاد، پروفیسر بچے کے دماغ کو ڈیمیج ہی کر دیتے ہیں جس سے اس کے Thinking process کو بہت نقصان پہنچتا ہے۔

ناگپال: نشوونما جو آپ کے وقت میں ہوتی تھی اور آج کی دنیا جو گلوبل ورلڈ ہے آج کے بچے کی نشوونما میں کیا فرق ہے؟

امر جلیل :آج اس کی کوئی پرواہ نہیں کی جاتی۔ پیدا ہوتے ہی اسے ماں باپ کا مذہب ملتا ہے، بڑا ہو کر اُسے اسی پروفیشنل میں ڈال دیا جاتا ہے جس میں عزیز اقارب ہیں۔آج کی پوری دنیا تجارتی بن گئی ہے۔لکھنے پڑھنے کی بجائے بچے کو عام طور پر کاروبار میں لگایا جاتا ہے۔نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جس علم سے بچے کے دل دماغ کو پروان چڑھانا ہوتا ہے وہ علم تو اسے ملتا ہی نہیں۔ایک بچے کو جب تاریخ نہیں پڑھائی جاتی تو سمجھو اسے کچھ نہیں پڑھایا گیا، اگر آرکیالوجی نہیں پڑھائی جاتی تو اسے یہ بھی علم نہیں ہوگا کہ میں ہوں کون؟ میرا ورثہ کیا ہے؟ پہلے جن کو آرکیالوجی پڑھائی جاتی تھی وہ اپنے اصل Roots سے جڑے رہتے تھے، آج کا تعلیمی نظام فقط روبوٹس ہی پیدا کرتا ہے۔ ہر آدمی بچے کو MBA دیکھنا چاہتا ہے۔MBA کا نصاب دیکھیں تو تاریخ کا کہیں نام نہیں ،آرکیالوجی کا کہیں پتہ نہیں، ادب کا کوئی ذکر نہیں بس سب کچھ حساب ہی ہے، اکاؤنٹس ہے۔

ناگپال: میں نے تو یہ دیکھا ہے کہ آج کے بچوں سے ان کا بچپن ہی چھینا گیا ہے۔یہ ہم اپنی نسل سے کیا کر رہے ہیں؟

امر جلیل: یہ صرف ہمارے ہاں ہی ہو رہا ہے اور کہیں نہیں۔اپنے محلے میں اسکول جاتے ہوئے بچوں کو دیکھتا ہوں اپنے سے بھاری تھیلا بھر کر کتابیں لے جاتے ہیں واپسی میں ڈھیر سارا ہوم ورک بھر کر لاتے ہیں۔تو کلاس میں استاد نے کیا پڑھایا؟ میں یہ یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ٹیچنگ کمیونٹی خاص طور پر اسکول میں لوگ پارٹ ٹائم جاب کرتے ہیں اسے اپنا پروفیشن نہیں مانتے۔ جیسے ہمارے دور میں ٹیچر پروفیشنل ہوتا تھا۔ہم خوش نصیب ہیں کہ ہمارے استاد خود کو تعلیمی سسٹم کا حصہ سمجھتے تھے اور نہ ہی ہمیں اتنا زیادہ ہوم ورک ملتا تھا۔ مجھے اپنے طالب علمی کا زمانہ یاد ہے ،ایسا کوئی اسکول نہ ہوتا تھا جس میں پلے گراؤنڈ نہ ہو۔N.J.V اسکول یا D.J.Sindh کالج کا اپنا کرکٹ، فٹ بال گراؤنڈ ہوتا تھا، رتن تلاؤ اسکول سے معلق ایک بڑا

کھیلنے کا میدان ہوتا تھا۔ ہمیں اس وقت تک چھٹی نہ ملتی تھی جب تک اس گراؤنڈ میں ہم ایک آدھ گھنٹے کھیل نہ کھیلتے تھے پھر گھر جانا ہوتا تھا۔

ناگپال: جی ہاں، ہمارے دور میں شام کو کھیل کے لئے اسمبلی ہوتی تھی، حاضری لی جاتی تھی اور نہ آنے والوں کو سزا ملتی تھی۔ کھیل کمپلسری، اب تو فلیٹوں میں اسکول کھل گئے ہیں یا بنگلے میں۔ اب کھیل کہاں سے آئے؟

امر جلیل: اس بارے میں بولنا پڑے گا کہ ادارے دیکھ کر پہچان میں آئیں۔ جیسے مسجد دور سے دیکھ کر پہچان لیتے ہیں مندر گرجا گھر اپنی پہچان رکھتے ہیں۔ اسی طرح اسکول کی بھی پہچان ہو۔ اسکول کے ماحول کا بھی بچے کی شخصیت پر گہرا اثر اپڑتا ہے۔ اب کے چھوٹے کلاس رومز، ایک دوسرے سے جڑے ہوئے، ایک کے بولنے کی آواز دوسرے کے بچوں کو ڈسٹرب کر دیتی ہے۔ پاکستان میں اب تعلیم ایک کمانے کا ذریعہ بن گئی ہے۔ It's flourishing industry پھر سب ترغیبات کو ٹیکس فری کیا گیا ہے کہ دس سال تک چھوٹ ہے تو اسے کمانے کا ہی بہترین ذریعہ بنایا گیا ہے۔

ناگپال: جی ۔۔تو اب اسکول Most profiting industry بن گئے ہیں ۔لوگ تعلیم میں بہت انویسٹ کرنے لگے ہیں۔

امرجلیل: اگر دس سال تک آپ سے کوئی ٹیکس نہ لے اور آپ طلبا سے ہر مہینے بھاری فیس چارج کرتے رہیں اور استاد کو آدھی بھی نہ دیں تو استاد پارٹ ٹائم ہی کرے گا نہ! 8,9 ہزار میں کس کا گزارہ ہوگا۔ آپ اسی استاد کو 12,15 ہزار روپے دیں تو دیکھیں وہ کبھی نہیں بھاگے گا۔

ناگپال: جناب اب ہم آتے ہیں انسان اور اس کائنات کے رشتے پر۔ ایک انسان کی اس وسیع وعریض کائنات میں آخر کیا حیثیت ہے۔ اتنی وسعت میں انسان کی شخصیت ایک نکتہ بن کر رہ جاتی ہے۔ آپ اسے کیسے محسوس کرتے ہیں؟

امر جلیل: آپ نے اس کی اچھے الفاظ میں وضاحت کر دی ہے بے شک انسان ایک نکتے

جیسی ہی حیثیت رکھتا ہے۔اسے احساس ہے کہ ایک نکتہ معنی تنہائی۔میں تنہا ہوں اور اکیلا ہی اس دنیا سے چلا جاؤں گا۔یہ تنہائی کا احساس اتنا ڈراؤنا ہے کہ اسے صرف صوفی اور درویش ہی قابو میں لا سکتے ہیں۔ہم جیسے گنہگار اور عام انسان تو اس خوف کو برداشت ہی نہیں کر سکتے۔دنیا میں سب سے خطرناک سزا۔سزائے موت نہیں پر قید تنہائی ہے۔یہ برداشت سے باہر ہوتا ہے پہلے ذکر کیا ہے کہ انسان ایک سوچنے والا جانور ہے کیونکہ اس کو دماغ عطا کیا گیا ہے جس سے وہ تنہائی پر قابو پانا چاہتا ہے۔ہزاروں مسلمان پانچ دفعہ مسجد میں جمع ہوتے ہیں تو انہیں تنہائی کا احساس نہیں ہوتا،اتنے سارے لوگ جو ہیں آپ کے ساتھ،مندروں میں پاٹھ پوجا کے لیے ہندو ملتے ہیں،عیسائی ہر اتوار کو گرجا میں اکٹھے ہوتے ہیں اس طرح کچھ احساس تنہائی کم ہوتا ہے۔

ناگپال: انسان نے کائنات کو اتنا حسین وجمیل کر دیا ہے سائنسی ٹیکنالوجی نے اتنے لوازمات پیدا کر لیے ہیں اور زندگی اتنی تیز دوڑتی ہے۔انٹرنیٹ اور موبائل نے فاصلے مٹا دیئے ہیں۔تو کیا یہ کمیونیکیشن ایج بھی اس کی کامیابیوں کی دلیل نہیں؟

امر جلیل :ہاں،مگر ہر چیز کی کہیں نہ کہیں کوئی حد ہونی چاہیے کہ اس کے بعد جو دوسرا قدم ہم لیں تو اس کا تجزیہ بھی ہو۔ایک ڈاکیومینٹری نے پوری دنیا کو جھنجھوڑ کے رکھ دیا ہے۔ایلگور کی Inconvenient Truth ایک ایسی خوفناک ڈاکیومینٹری ہے جس میں وہ کہتا ہے کہ ہمالیہ سے نکلتی ہوئی 7 ندیاں 50 سال میں خشک ہو جاتی ہیں۔آج کے بچے 50 سال بعد 60,70 کے ہوں گے مگر ان کو پینے کا پانی بھی نہیں ملے گا۔لوگ کھانے پینے کی تلاش میں خانہ بدوش ہوں گے۔50 سال بعد میں تو نہیں ہوں گا مگر میں دوسرا جنم لے کر ضرور آؤں گا،میری بہت سے باتیں یہاں ادھوری رہتی ہیں۔مگر میں یہاں پیدا نہیں ہوں گا I will use my own decision کہ کہاں پیدا ہونا ہے۔

ناگپال: آپ کیا بننا پسند کریں گے؟ کیا دوبارہ امر جلیل ہونا پسند ہوگا؟

امر جلیل:اگر دل سے بولوں تو میں مہاتما گوتم بدھ کا بھکشو ہوں اور میں اصل میں بھکشو ہونا

ہی پسند کروں گا ان بھکشوؤں میں سے ایک جو مہاتما بدھ کے ساتھ ہوتے تھے۔

ناگپال: شاہ لطیف کے سر رامکلی میں جو جوگیوں کا تصور ہے، کیا آپ پر اس کا اثر ہے؟

امر جلیل: نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کا اثر نہیں۔ بھکشوان جوگیوں سے مختلف ہیں۔

ناگپال: راجا گوپی چند گورکھناتھ کے پاس آ کر بھکشو بنا، کیونکہ وہ راج چھوڑ کے آیا تھا تو گورکھناتھ نے اسے کہا کہ جاؤ سب سے پہلے اپنے محل سے بھکشا لے آؤ۔ بھکشوؤں کے بھیس میں وہ کشکول ہاتھ میں لیے بھیک مانگتا رہا لوگ بڑھ چڑھ کر دان دینے لگے۔ آخر محل کے دروازے پر پہنچا۔ بیوی نے جب دیکھا تو اپنے سارے گہنے اتار کر کشکول میں ڈال دیئے مگر ماں نے کہا جوگی سنو میں دینے والی ہوں۔ تو لینے والا ہے میری مرضی ہے میں کچھ بھی دوں۔ میں تمھیں تین نصیحتیں دیتی ہوں۔

1۔ سب سے اچھے بستر پر سونا

2۔ سب سے اچھی غذا کھانا

3۔ سب سے مضبوط قلعے میں رہنا

گوپی چند نے کہا آپ میری امی ہیں مگر یہ سب کچھ تو میں چھوڑ چکا ہوں۔ ماں نے کہا بیٹے تم نے سمجھا ہی نہیں، تم نے کیا گیان سیکھا ہے؟ (1) اچھی غذا سے مطلب ہے اپنے تن کو بھوکا رکھو، مجاہدہ کرو جب بے انتہا بھوک ہو تو سوکھی روٹی بھی سب سے اچھا کھانا لگے گی۔ (2) تم جوگ کرتے ہو بیدار رہتے ہو، مراقبہ کرو جب تک نیند تم پر غالب نہ آ جائے تب تم کو سخت زمیں بھی پلنگ لگے گی اور (3) تم جوگی ہو عورتیں مرد بچے سب تجھ سے ملنے آئیں گے۔ حسین چہروں سے خود کو حفاظتی قلعے میں محفوظ کر لو، تو من پر قابو ہو اور منزل آسان ہو جائے۔ تو آپ شاید یہی لالچ بھکشو کا تصور رکھتے ہیں جو شاہ لطیف کی زبان میں نہ خودی رکھتے ہیں اور نہ اپنے ساتھ کچھ سامان یا مال ملکیت۔

امر جلیل: جی یہ سب تو زنجیریں ہیں کچھ تمنا لالچ یا طمع ہو کچھ پانے کی! تو یہ پاؤں کی بیڑی

ہوئی نہ؟ نروان تو ملتا ہے جب انسان ان خواہشوں سے آزاد ہو جائے۔

ناگپال: مذہب اور تصوف میں کیا فرق ہے؟

امر جلیل: سائیں بہت زیادہ فرق ہے مگر لوگ دونوں کو Mix up کر دیتے ہیں مگر میں ان لوگوں کا بھی احترام کرتا ہوں کیونکہ میں ایک Diehard Democrate ہوں۔ اگر میں اپنی بات پر اٹکا ہوا ہوں تو دوسروں کی رائے کا بھی مان رکھنا چاہیے۔ وہ جو صوفی ازم کو بھی مذہب کی شکل کہتے ہیں۔ جیسے مسلمانوں کا مسلم صوفی تھاٹ ہے۔ وہ اس لئے ہے کہ وہ مذہب سے آگے کچھ دیکھ ہی نہیں سکتے۔ صوفی ہونے کے بعد بھی ان کے ذہن میں کوئی نہ کوئی کھڑکی کھلی ہی رہ جاتی ہے جو آگے چل کر Active ہو جاتی ہے مگر وہ انسان کے اندر جب تجسس اور خود کچھ سچائی پانے کی لگن بیدار ہوتی ہے تب وہ آزاد ہوتا ہے اور اپنی تلاش شروع کرتا ہے۔ مگر والدین کے بندھے ہوئے زنجیر اس قدر مضبوط ہوتے ہیں کہ وہ ان کو بھی ملا دیتا ہے۔ شاہ لطیف بھی اکثر اوقات خالص صوفی ازم سے نکل کر مسلم تصوف پر آجاتا ہے۔ بچپن کی Conditioning سے نکل پانا بہت مشکل ہے۔ جبھی میں کہتا ہوں کہ سچل سرمست مکمل خالص صوفی تھا، اس آزاد انسان کو منصور ثانی کہتے ہیں مگر منصور بھی کہیں کہیں اٹک جاتے تھے کہ بچپن سے ماں باپ کی جو زنجیر پہنائی ہوئی تھی وہ پھنسا دیتی تھی۔ مگر سچل اس سے بھی آزاد ہو گیا تھا واضح کہہ ڈالو کہ ''مذہبوں نے انسانوں کو الجھا دیا ہے، پیروں، پنڈتوں اور مولویوں نے بہت ساروں کو بھٹکا دیا ہے۔''

ناگپال: مذہب سے اتنی بغاوت شاید ہی کسی نے کی ہو؟

امر جلیل: کبیر نے کی تھی۔ کبیر نے تو تمام حدیں پار کر دیں۔ مجھے تو حیرت ہے کہ کبیر کو ہندوؤں اور مسلمانوں کے سماج نے چھوڑا کیسے؟ اسے تو ذبح کر دیا ہوتا۔ وہ کھلے بندوں گیتا کو، ویدوں کو، قرآن کو رجیکٹ کر رہا ہے۔ کبیر وحدت میں ہی تمام لوگوں کو دیکھتا ہے، ایک میں انیک کو پاتا ہے، اور انیک میں ایک کو۔

ناگپال: سائیں لطیف سرکار کی طرف چلیں جو کہتا ہے ''یہ وہ ہے وہ بھی یہ ہے، وہی اجل

ہے جو اللہ ہے، جو سانس ہے وہی محبوب ہے جو دشمن ہے وہی تو محافظ ہے"

امر جلیل :یہی تو ہے Creator of all Creators۔خالقوں کا خالق۔کیا ہے؟اپنی سمجھ سے تو اعلیٰ ہے،لامحدود ہے، ہر جگہ ہے۔ہمارے اندر میں بھی ہے ہمارے باہر بھی ہے۔وہی ظاہر وہی باطن، حاضر اور غائب۔

ناگپال: بھلا انسان تو فنا ہے اس میں کیا امر ہے؟ کچھ لافانی ہے؟اس فانی اور لافانی کے رشتے کو بتائیں، محدود کا لامحدود سے رشتہ یا بندے اور اللہ کا تعلق؟

امر جلیل :بندے اور اللہ والی بات الگ ہے، پہلے والی انسان کی بات کریں۔اس پر تمام یا بہت زیادہ ادب لکھا گیا ہے اور اب بھی لکھا جا رہا ہے اور یہ کتب Best Sellers میں شامل ہیں۔خاص طور پر یورپ اور انڈیا میں جہاں دس میں سے پانچ یا چھ کتابیں اس موضوع پر ہونگی؟What is man زندگی کیا ہے؟ مرنے کے بعد یہ کیا ہوگی؟ان موضوعات پر ان گنت کتب ہیں۔جو بھی غور وفکر کرنے والے ہیں وہ اس پہ متفق ہیں کہ (جسم کے مرنے سے۔روح کی موت نہیں ہوتی)

"Physical death of a person is not the death of the soul that resideth in man.

ہم اگر اس پر سپیکٹو میں دیکھیں تو موت حقیقت میں روح کی آزادی ہے۔آپ اس کو سوچ بھی کہہ سکتے ہیں، کوئی انرجی بھی کہہ سکتے ہیں جس کی آزادی کے بعد جسم ناکارہ ہو جاتا ہے اور جو چیز آزاد ہوتی ہے وہ کوئی بڑی قوت ہے، کوئی طاقت ہے یا کوئی شکتی ہے۔جو انسان کو چلاتی رہی ہے انسان Individual نہیں۔یہ پورا عمل زندگی کا سلسلہ ہے، ایک شخص کے مرنے سے اس پر وسیس میں کوئی فرق نہیں آتا۔روح ایک جسم سے نکل کر دوسرے میں داخل ہوتی ہے، کہیں نہ کہیں تو وہ انرجی خرچ ہوتی ہے۔اس موضوع پر بہت سارا ادب ہے، اس پر بہت زیادہ لکھا گیا ہے۔

ناگپال: آدمی کے اندر جو انا ہے، خود پرستی ہے خود پسندی ہے، یہی اس کی ترقی یا تباہی کی وجہ ہے۔Ego۔یہ Ego کتنا ضروری ہے۔یہ آدمی کو کتنا فائدہ یا نقصان دیتا ہے۔اپنی انا پرستی

کی وجہ سے آدمی کچھ کرتا ہے اور کچھ نہیں کرتا۔ آپ انا کو کیسے دیکھتے ہیں بقول اقبال خودی کو کر بلند اتنا کہ، ہر تقدیر سے پہلے خدا خود بندے سے پوچھے، بتا تیری رضا کیا ہے۔

امر جلیل: آپ نے سوچ میں ڈال دیا۔ اس کے مختلف جواب ہو سکتے ہیں، اس کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں۔ آدمی ازل سے ظالم رہا ہے۔ یہی نہیں کہ صرف اس دور میں بے گناہوں کو پھانسی چڑھایا جاتا ہے اور پہلے سزا صرف گنہگاروں کو ملتی تھی۔

جب سے انسان اس دنیا میں آیا ہے گنہگاروں کی جگہ بے گناہوں کو ہی پھانسی پر لٹکایا گیا ہے۔ It's another Process ایک شخص کو پھانسی کی سزا ملی ہے اور جب تک وہ معافی نہیں مانگتا، گڑگڑاتا، نہیں منتیں سماجتیں نہیں کرتا، فرمانروا کی قدم بوسی نہیں کرتا تب تک اس کی جان نہیں بچ سکتی۔ تو اب اس کے اندر Ego پیدا ہوتا ہے یا جو بھی آپ اسے نام دیں تو وہ اس بات پر اڑ جاتا ہے، اسٹینڈ لے لیتا ہے کہ بھلے آپ تختہ دار پر لٹکا دیں معافی نہیں مانگوں گا۔ کہ میں نے ایسا کچھ کیا ہی نہیں۔ آپ مجھے مارنا چاہتے ہو تو مار دو باقی اس شرط پر زندگی ملے گی کہ ظالم کے آگے سر جھکا لوں، ہاتھ جوڑ لوں کہ مجھے بخش دے تو وہ میں کبھی نہیں کروں گا، ''یہ جان تو آنی جانی ہے اس جاں کی تو کوئی بات نہیں''۔ تو اس صورت میں آپ کا پڑھا ہوا اقبال کا شعر صحیح ہے۔ کہ کوئی اگر اس قدر بہادر بن کر کھڑا ہو جاتا ہے تو ظالم بھی کانپ جاتا ہے اور سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ عجیب قسم کا آدمی ہے۔ مجھے بھی معلوم ہے کہ بے گناہ ہے مگر یہ صرف مجھ سے معافی طلب کرے تو میں اسے بخش دوں۔ پر نہیں وہ انسان اٹھ کھڑا ہو جاتا ہے کہ دس دفعہ پھانسی پہ لٹکا دو، معافی مانگنے سے انکار کرتا ہے۔ ایک یہ انا کا قسم ہے۔ ایک شخص پڑھا لکھا ہے مگر نوکری تو سفارش پر ملتی ہے وہ صاحب کے پاس جا کر منت کرے کہ میرے پاس سفارش نہیں۔ اللہ کا واسطہ ڈالے تو اس کا Ego اسے روکتا ہے۔ کہ بھلے نوکری نہ ملے بھوکا رہوں گا، بھلے کسی اور کو سفارش پر مل جائے۔ مگر یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر دنیا میں ناانصافی بڑھ جائے گی، جب تک آپ اسے Resist نہیں کریں گے اس کے خلاف احتجاج نہ کریں گے، آواز نہ اٹھائیں گے کہ میں Qualified ہوں

آپ نالائق لوگوں کو بھرتی کرتے ہیں۔ میں نے تو اپنے Ego کو مار دیا ہے۔اندر میں تو میں ہوں ہی نہیں۔پھر تو دنیا میں ناانصافی بڑھتی جائے گی۔یہ سوال اتنا Complicated ہے کہ میں نے اس پر کبھی سوچا ہی نہیں۔آپ نے اب بات کی ہے اس پر Sessions ہونے چاہئیں۔

ناگپال: اگر آپ خود کو سندھی میں چھید Analyse کریں تو کیا کہیں گے؟

امر جلیل: میں خود کو اردو والا چھید کر دوں گا، خود کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا۔

ناگپال: بھلا آپ خود کو پسند ہیں یا نہیں؟

امر جلیل :ناپسند والی بات۔بہت پہلے کسی درویش سے سبق سیکھا تھا کہ جب تک خود کو خود سے آزاد نہ کریں گے تب تک Liberty حاصل نہیں ہو سکتی۔تو شوق پیدا ہوا کہ خود کو خود سے کس طرح آزاد کیا جائے۔اس کے کئی عملی انداز بھی ہیں جن پر عمل کیا جا سکتا ہے۔

50 سال پہلے کی بات ہے اس نے مجھے آئینے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اس کی نفی کرو خود کو خود سے آزادی مل جائے گی۔اس وقت سے وہ بات میرے ذہن میں بیٹھ گئی۔آج تک پھر میں نے سر اٹھا کر آئینے کو نہیں دیکھا۔لوگ تو لفٹ میں چڑھتے ہیں تو ایک دفعہ آئینے کو ضرور دیکھتے ہیں ابھی آزاد نہیں ہوئے۔تم آئینے سے انکار کرو آئینے میں بڑی قوت ہے، آئینہ خود بھی ایک طاقت ہے۔اس طاقت کو جب آپ توڑیں گے اس کے Against جائیں گے تو آپ آزاد ہو جائیں گے۔

ناگپال :خود پسندی سے آزاد ہونا بڑا کٹھن مرحلہ ہے۔ہر انسان کے زوال کا سبب یہی خود پرستی ہے۔میں آپ کو اس کی مثال دیتا ہوں کہ اگر میں آپ کو ایک گروپ فوٹو دوں تو آپ سب سے پہلے کس کو دیکھیں گے؟ خود کو! چاہے آپ کے ساتھ آپ کا محبوب بھی کھڑا ہو جسے آپ بہت چاہتے ہیں لیکن آپ کی نظریں خود کو ہی تلاش کریں گی۔

امر جلیل :خود سے جان چھڑانا بڑا مشکل، سب سے کٹھن کام ہے۔اور یہی ہمارا Target ہے۔اس کا پہلا سبق مجھے آئینے سے ملا۔مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ Rex سینما میں فلم

دیکھنے جاتے تھے۔سینما کے سامنے ایک میوزیکل فاؤنٹین ہوتا تھا جہاں ستار رکھی رہتی تھی اور گول گھومتی تھی تو اس سے موسیقی نکلتی تھی۔سینما کی سیڑھی چڑھتے تھے تو سامنے آئینہ لگا ہوتا تھا، آتے جاتے میں نے کئی لوگوں کو گرتے دیکھا کہ نظریں سیڑھی پر نہیں سامنے لگے آئینے میں خود پر ہوتی تھیں۔

ناگپال :جو زندگی اب تک گذار چکے ہیں اس میں کون سا رول آپ کو زیادہ پسند ہے جیسے ایک اچھا کھلاڑی، ایک عمدہ دوست، ایک سچا عاشق، ایک ماہر ٹیکنالوجسٹ، ایک لیجنڈ فلمکار، آپ کس کردار کو زیادہ اپنانا چاہتے ہیں؟

امر جلیل :کرکٹر یا ایک اچھا کھیلنے والا روپ۔اس کے دو اسباب ہیں۔اچھے اچھے کھلاڑی جو میرے ساتھ کھیلتے تھے اب انہوں نے سب کچھ بھلا دیا ہے، ہاں ملیں گے تو ذکر ضرور ہوگا مگر اس کھیل سے زندگی کی وابستگی اب نہیں رہی۔میرے لئے کرکٹ ایک نظریۂ حیات بن گیا ہے۔ ایک کھیل نہیں فقط۔آپ بیٹنگ کرنے جاتے ہیں You are born آپ کی دنیا میں آمد ہے اب اپنی قابلیت ثابت کریں سامنے گیارہ لوگ 22 بازو لیے 22 ٹانگیں لیے اور 22 آنکھیں آپ کو اس میدان سے واپس بھیجنا چاہتی ہیں۔آپ اکیلے ہو اور ان سب کا سامنا ہے۔ یہ کھیل کا میدان پوری کائنات ہے اور تم تنہا ہو اور فیصلہ کرے گا امپائر جو ایک ریاست ہے تو Its Individual Versus State یہ فلسفہ میرے لیے اب بھی جاری ہے۔عملی طور پر میں اب کرکٹ نہیں کھیلتا مگر میری روح میری سوچ اور میرا سب کچھ اس اسپورٹس مین والا ہی چل رہا ہے۔جس نے جیتا ہے، جا کر اس سے ہاتھ ملاؤ اور اپنی ہار تسلیم کرو۔میرا خیال ہے یہ عمل آخر تک جاری رکھوں گا، جب تک میں اس دنیا کو الوداع کہوں گا ایک اسپورٹس مین اسپرٹ کے ساتھ مسکراتے ہوئے کہوں گا تھینک یو I Leave Now۔

ناگپال: مطلب آپ اب تک گذرے ہوئے وقت سے مطمئن ہیں؟

امر جلیل: جی میں جانے کو ہر وقت تیار ہوں۔موت میرے دروازے پر کھڑی ہے، دستک

دے رہی ہے۔

ناگپال: اپنی اس قلمکار کی حیثیت کے متعلق کیا کہیں گے؟

امر جلیل: میرے ایک کھلاڑی کے جذبات ان پر حاوی ہیں۔ باقی جو آپ یہ لکھنے والی بات کر رہے ہیں تو اس میں بھی میں بچ گیا۔ میرے کئی ساتھی قلمکار چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بٹ گئے ہیں جب ہم کسی گروہ میں شامل ہوتے ہیں تو اس کی فکر کو حاوی کر کے لکھتے ہیں، آزاد اور بے اختیار لکھنا ہو نہیں سکتا۔ پھر یہ سوچیں گے، فلاں میرا اچھا دوست ہے وہ کیا سوچے گا، فلاں کو یہ کیسا لگے گا؟ اس سے ایک قلمکار کو آزاد ہونا چاہیے کہ ہم جو بھی لکھتے ہیں پڑھنے والوں کو Communicate کرنے کو لکھتے ہیں، جو پیسے دے کر وہ کتاب یا رسالہ خریدتا ہے تو اس کے لیے لکھو اور اسی سے شیئر کرو۔

ناگپال: یہ جو ادب میں تحاریک شروع ہوئی ہیں سوریلزم، نیچرل ازم، رئیلزم، اسٹریم آف کانشسینس وغیرہ آپ ان کے لیے کیا محسوس کرتے ہیں؟

امر جلیل: یہ سارے الگ الگ کمپارٹمنٹس ہیں۔ ایک کریٹیو رائٹنگ کا، جہاں لکھنے والا یہ نہیں سوچتا، کہ میں اسٹریم آف کانشسینس میں لکھوں گا کہ نہیں لکھوں گا۔ مگر نقاد بیٹھ کر اس کی Analysis کرے گا۔ مجھے ہیمنگوے کے انٹرویو میں ایک جواب بہت پسند ہے۔ پیرس ریویو میں رائیٹرز کے بہت اچھے انٹرویوز چھپتے ہیں۔ ان سے پوچھا گیا کہ آپ کی فلاں علامت بہت عمدہ تھی۔ تو جواب دیا کہ یہ میری زندگی میں پہلی دفعہ خبر آئی ہے کہ میں علامتیں بھی استعمال کرتا ہوں۔

وہ ادیب خوش نصیب ہوتے ہیں جنہیں اچھے نقاد ملتے ہیں، مجھے تو سندھی نقاد سے ڈر لگتا ہے ایک شخص نے سندھی ادب میں پی ایچ ڈی کی ہے اور عنوان ہے ''سندھ کے دینی مدرسے'' اب یہ ڈاکٹر صاحب بیٹھ کر کہانیوں اور ناولوں پر تبصرے کرے تو ہمیں تو مار دیگا۔ ایسے کرٹک، کریٹیو رائیٹر کی کیا درگت بنائیں گے، بالکل برباد کر دیں گے۔

ناگپال: ابھی کچھ اور کرنا چاہتے ہیں، کچھ خوابوں کی تعبیر باقی ہے؟

امر جلیل: کوئی سپنا ہے ہی نہیں۔ لکھنے کے حوالے سے بھی میرے اندر احتجاج ہے، انکار ہے اور کرودھ ہے، شدید غصہ ہے، اس سسٹم کے خلاف میرا خون کھول اٹھتا ہے۔ میں 60 سال سے غصے اور طیش کی حالت میں ہوں۔ پاکستان کو صدر بھی Back Door سے آیا ہوا ملتا ہے، چاہے اسے سپریم کورٹ نے نظریہ ضرورت کے تحت جائز بنا دیا ہو۔ میرا خیال ہے کہ جو شخص غلط طریقے سے اقتدار میں آیا ہو، اسے سو صحیفے بھی جائز قرار دیں تو میرے لیے وہ غلط ہی ہے۔ آپ کے وزیراعظم کے لیے اعلان کر کے سیٹیں خالی کروالی گئیں، کیونکہ آئین کی ضرورت ہے کہ وہ اسمبلی کا منتخب ممبر ہونا چاہیے۔ اسے جھوٹے طریقے سے الیکٹ کروایا جاتا ہے اور دونوں مل کر آئین کا ستیاناس کر دیتے ہیں۔ میں ایسے حکام کو قبول نہیں کرتا۔ میں کل کی بات بتاتا ہوں۔ چوراہا کراس کرتے سبز بتی پیلی میں بدل کر لال ہو جاتی ہے۔ اب میں بھی بیچ میں ہوں اور گاڑی کھڑی کر دی۔ سپاہی نے مجھے نکلنے کا اشارہ دیا، میں آگے آیا تو انسپکٹر نے روکا۔ آگے ایک موٹر سائیکل پر سپاہی آیا اور دوسرا راستہ کاٹ کر سامنے آیا۔ تو میں نے کہا تمہارے سپاہی نے مجھے آگے نکلنے کو کہا آپ کے سگنل قانون کے مطابق نہیں چلتے، اکثر اشارے بند ہوتے ہیں۔ کہنے لگا گاڑی کاغذات، لائیسنس اور شناختی کارڈ دکھاؤ۔ میں نے کہا میرے پاس کچھ نہیں ہے، میں اس ملک سے کوئی تعلق نہیں رکھتا جہاں قانون کی کوئی پاسداری نہیں ہوتی، میں یہاں کا باشندہ ہو نہیں سکتا۔ تو پوچھا کہیں باہر سے آئے ہو؟ میں نے کہا باہر سے آؤں یا اندر سے، تمھیں صاف بتا رہا ہوں کہ میرے پاس کچھ نہیں ہے تم مجھے صرف تھانے لے جا سکتے ہو۔ کالے شیشے لگانے پر پابندی ہے، مگر پجارو اور پراڈو گاڑیوں پر نہیں چلتی، باقی ہماری چھوٹی گاڑیوں کے شیشے کالے ہیں یا پیلے، انہیں چالان بھی کرنا ہے، بے عزت بھی کرنا ہے۔ پھر میں نے سوچا کہ میں اپنی انرجی ضائع کر رہا ہوں، اس انسان سے بحث کر رہا تھا جس کی کوئی وقعت نہیں۔ یہ غصہ تو میرے اندر تھا، جو کچھ میرے چاروں طرف ہو رہا ہے۔ یہاں چیف جسٹس پر الزام لگتا ہے کہ وہ پٹرول کی جھوٹی رسیدیں بنواتا ہے۔ اپنے بیٹے کی گاڑی میں پٹرول بھرواتا ہے، جس کی پیمنٹ کوئٹہ میں ہوتی ہے۔ جہاں اس

قسم کی لغو باتیں اور بہتان لگیں وہاں انسان کیسے نہ فرسٹیڈ ہوگا؟ یہ کہتے ہیں یہاں 25% لوگ مینٹلی ڈسٹرب ہیں، میں بھی ان میں سے ایک ہوں۔ جب میں اپنے چاروں طرف دیکھتا ہوں تو مجھے میرا صدر Legitimate نہیں لگتا، میرا وزیراعظم Legitimate نہیں لگتا آئین بھی صحیح طور پر امینڈ ڈ نہیں، تو آدمی کیونکر نہ پاگل ہو!

ناگپال: آپ کی ذاتی پسند ناپسند پر آتے ہیں۔ کچھ کرنے کی خوشی تو سب کو ہوتی ہے پر کچھ نہ کرنے کی خوشیاں بھی ہوتی ہیں، یا کچھ نہ کر سکنے کا دکھ ہوتا ہے؟ آپ نے کبھی محسوس کیا؟

امر جلیل :میں نے جس بات کو غلط سمجھا وہ نہ کی اور جسے صحیح سمجھا وہ کی، مجھے کوئی پشیمانی نہیں۔ مثال کے طور پر مجھے آفر لیٹر بھیجا گیا کہ لینگویج اتھارٹی میں چیئرمین بننے کا، جو چار مہینوں سے آرڈر پڑا ہوا تھا، مجھے کہا گیا کہ آیئے جوائن کیجیے۔ میں نے جواب دیا کہ میں پچھلے چار مہینوں سے ایک پروجیکٹ ایشین بنک کے ساتھ کر رہا ہوں۔ ابھی تک میری تصویر لینگویج اتھارٹی کے دفتر میں لگی ہوئی ہے۔ حیرت کی بات ہے نہ میں نے جوائن کیا، نہ ہی کبھی ایک دن کے لیے بھی اس کرسی پر بیٹھا اور نہ تنخواہ لی، پھر کیوں میری تصویر آویزاں کی گئی۔ میں نے لکھ کے بھیجا کہ بابا جو چیئرمین ہو وہ سندھی زبان کا بندہ ہونا چاہیے، زبان میں ایم اے ہو کم از کم، میری سندھی زبان کے متعلق نہایت کم معلومات ہیں، میں جو لکھتا ہوں وہ 800 سے ایک ہزار الفاظ کا کرشمہ ہے، آگے تو مجھے کچھ معلوم نہیں، میں اپنی حدیں جانتا ہوں۔ یہاں وہ آدمی بیٹھے جو لسانیات کا ماہر ہو، سندھی میں ریسرچ کی ہو۔ ایک کریئیو رائیٹر ڈرامہ کہانی یا شعر لکھنے والے کا یہ کام نہیں کہ وہ اس کرسی پر جا کر بیٹھے، سو میں نے لکھ کر بھیج دیا۔ اس کا مجھے نہ افسوس ہے نہ خوشی۔ کچھ نہ کرنے کے دو دکھ ہیں۔

پہلا مجھے پائلٹ بننے کا بہت شوق تھا نہ بن سکا۔

دوسرا ٹیسٹ کرکٹ نہ کھیل سکنے کا دکھ۔

ناگپال: کوئی خواہش باقی ہو یا کچھ دیکھنے کی تمنا؟

امر جلیل :بنارس/کاشی میں مرنے کی خواہش ہے۔ بندرابن، متھرا، گوکل اور رادھا کا

گاؤں دیکھنے کی تمنا ہے۔

ناگپال: خالق کی قربت پانے کو کیا ضروری ہے۔

امر جلیل: کسی کو دکھ نہ دینا، کسی کو تکلیف نہ دینا، کسی کا بھی خون، چاہے وہ جائز ہو یا ناجائز ، نہ بہانا، اس کے متعلق سوچنا بھی گناہِ عظیم سمجھنا۔ آپ کو اس خالق کی قربت دلا دے گا۔

You become One with the Eternal One.

ناگپال: اپنی ازدواجی زندگی کے متعلق بتائیں۔

امر جلیل: میں زندگی بھر اس افسوس کا شکار رہا کہ مجھے شادی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ میں شادی شدہ زندگی کے لیے بالکل فٹ نہیں۔ طبیعتاً میں اس کا حامل ہو نہیں سکتا۔ کیونکہ میں جو کرنا چاہتا ہوں وہ کر نہیں پاتا۔ میں ایک آزاد منش ہوں، دنیا دیکھنا چاہتا ہوں ایک جگہ ٹک نہیں سکتا۔ جوگیوں کا سا سیلانی ہوں۔ زندگی اگر وڈیو ٹیپ پر ریکارڈ ہوتی تو ایڈیٹنگ کے دوران میں اپنی زندگی سے شادی شدہ حصہ حذف کر لیتا۔

انٹرویو نمبر2

نہایت مقبول و مشہور شخصیت ہونے کی وجہ سے لوگ ان سے ملنا، سننا اور جاننا چاہتے ہیں۔ کہ وہ کیا سوچتے ہیں اور مختلف موضوعات پر ان کے خیالات کیا ہیں وغیرہ۔ کئی دفعہ تو ان کی ذات کے متعلق بہت سے سوالات آتے ہیں۔ ان کا ایک مکمل انٹرویو تو میں یہاں دے رہا ہوں جو مجھے وسیلہ بنا کر لیا گیا، باقی کچھ انٹرویوز کے کچھ اقتباسات مندرجہ ذیل پیش کر رہا ہوں۔

ماہوار سھٹي ایک بے باک مقبول ماہنامہ تھا جو حیدر آباد سے طارق اشرف مرحوم جیسے بے باک شخص نکالتے تھے۔ انہوں نے زندہ شخصیات پر نمبر نکالنے کی روایت ڈالی اور پہلا نمبر تھا امر جلیل کا۔ جس کی ہم تقلید کرتے ہوئے امر جلیل نمبر 2 بھی لا رہے ہیں اور پہلے کو بھی دوبارہ شائع کر رہے ہیں، کہ لوگ آج بھی اسے پانے کو مشتاق ہیں۔ اس میں سے دو جواب کچھ یوں ہیں۔

''میں تحریر کی آزادی اور شخصی آزادی کی جنگ لڑ رہا ہوں۔ یہ میری جنگ ہے اور مجھے خود اکیلے

ہی، جیل کے اندر اور جیل کے باہر یہ جنگ لڑنی ہے۔"

"اگر میرے لکھنے پر باقاعدہ بندش لگائی گئی تو میں یہ ملک چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ دنیا کی کئی زبانوں کا ادب جلاوطنی میں تخلیق کیا گیا ہے اور میں جلاوطنی میں لکھنے کو تیار ہوں۔"

انٹرویو نمبر 3

پرک۔ جنوری۔ فروری 1997

انٹرویورز: نصیر مرزا، نثار منصور

سوال: سندھی زبان کے کہانی کار امر جلیل انگریزی، اردو کالم نگاری میں کیوں الجھ گیا ہے جبکہ سندھ کے کئی سو مسائل اس دردمند کہانی کار کی طرف گیلی آنکھوں سے تک رہے ہیں؟

امر جلیل: زبان اظہار کا ذریعہ ہوتی ہے۔ میں سندھی میں لکھوں، اردو میں لکھوں یا انگریزی میں لکھوں۔ میرا موضوع سندھ ہی ہوگا۔ میری پہچان سندھ سے ہے۔ سندھ کے سوائے میں بیگانہ، بے کار اور گمنام ہوں۔ سندھ کے متعلق میں بہت کچھ انگریزی میں لکھنا چاہتا ہوں اور وہ بھی پاکستان سے باہر۔ کوئی ادیب کس زبان میں لکھتا ہے یہ اہم نہیں ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ادیب اپنی تحریر میں لکھتا کیا ہے اور کسی موضوع پر لکھتا ہے۔

سوال: امر جلیل ایک باغی اور ہٹھیلے کرداروں کی خالق تھے جس کی تحریروں میں ایک نئی سندھ دیکھنے کے خواب تھے، جدوجہد تھی۔ زندگی کے اس چوراہے پر کھڑے ہو کر اب امر جلیل کیا محسوس کر رہا ہے؟

امر جلیل: ادیب کا کام ہے لکھنا، مسلسل لکھنا، ادیب تبدیلی کا انتظار نہیں کرتا وہ بس لکھتا ہی رہتا ہے۔ کئی مثالیں موجود ہیں کہ تبدیلی ادیب کے مرجانے کے بعد آئی تھی۔ ایک مثال بورس پیٹر ناک کی ہے۔ آرتھر کوئسلر کی ہے۔ دونوں کے مرنے کے بعد روس میں تبدیلی آئی اور پھر سوویت یونین ٹوٹا۔ ہر کمٹڈ ادیب نتیجے سے بے نیاز لکھتا ہی رہتا ہے۔

سوال: انسپریشن ایک ایسا لفظ ہے جو بہت بدنام کیا گیا ہے۔آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟

امرجلیل: میں انسپائر نہیں ہوتا میں ری ایکٹ کرتا ہوں اور میرا ری ایکشن انسٹنکٹو Instinctive ہوتا ہے۔

سوال: کہانی لکھنے کا فن کس افسانہ نگار سے سیکھا؟

امرجلیل: مجھے کچھ معلوم نہیں، لکھنا میرا شوق نہ تھا، میں نے لکھنے کی ضرورت محسوس کی، اگر میں نہ لکھتا تو اسٹریٹ فائیٹر ہوتا جو وڈیروں کو پجاروں سے نکال کر مکے مارتا، سیاستدانوں کے گھروں پر راکٹ لانچر سے حملے کرتا، مطلب وان ڈیم کی طرح کام کرتا۔

لکھنے میں میں نے مسلسل تجربے کئے۔کچھ کہانیاں سکرین پلے کے ٹیکنک پر لکھیں۔کچھ کہانیاں اسٹیج پلے کے ٹکنیک پر لکھیں۔تجربے کرتے کرتے میں نے کہانی کا کلائمیکس سے شروع کرنے کا ہنر پالیا۔میری کسی کہانی کی ابتدا صبح صادق کو کسی باغ کے رومانی ماحول سے نہیں ہوتی۔میری ہر کہانی کی شروعات کسی کردار کے فنا ہونے سے شروع ہوتی ہے اور دوست کہتے ہیں کہ امرجلیل کی ساری کہانیاں ایک سی ہوتی ہیں۔

سوال: کہانی لکھنے کا مرحلہ کتنے وقت میں تکمیل پاتا ہے اور کتنی نشستوں میں مکمل ہوتا ہے؟

امرجلیل: ٹیبل کرسی پر بیٹھ کر کہانی لکھنا آخری مرحلہ ہوتا ہے۔صرف دس فیصد شاید باقی نوے فیصد کہانی تو چلتے پھرتے، کام کاج کرتے، کھاتے پیتے یا سوتے جاگتے تخلیق کے مراحل طے کرتی ہے۔

سوال: آپ کی پسندیدہ کتب؟

امرجلیل: دوستووسکی کی کتاب کرائم اینڈ پنشمنٹ، پیٹر ناک کی ڈاکٹرز واگو، ڈکنس کی اے ٹیلی آف ٹوسٹیز، آرتھر کونسلر کی ڈارکنیس ائٹ نون، جبران کی پرافٹ، کرشن چندر کی غدار اور سیرویان کی ہیومن کامیڈی وغیرہ۔

آتم کتھا (Autobiography) سے اقتباس

امر جلیل کی تحریر میں جو سحر ہے جو جادو ہے جو پڑھنے والے کو کسی کوہ قاف کی دنیا میں لے جاتا ہے الفاظ کی مدھ پلا کر اپنا عادی بنا لیتا ہے۔ آیئے آپ کو بھی اس سحر انگیز نگری کی سیر کرا دیں ورنہ اس کے بغیر آپ اس کی شخصیت اور تحریر کو اچھی طرح سمجھ نہ پائیں گے۔ عنوان ہے نوابشاہ، نوابشاہ

''جب تک رسالپور سے پائلٹ بننے کے لئے آخری انٹرویو کا بلاوا نہ آیا تھا اس وقت تک ہر چیز معمول کے مطابق تھی۔ تب میں D.J سائنس کالج میں انٹر سائنس کا طالب علم تھا۔ زندگی میں دو خواہشوں کے علاوہ تیسری کوئی خواہش نہ تھی۔ ایک خواہش یہ تھی کہ امتیاز احمد کی طرح ٹیسٹ وکیٹ کیپر اور ہارڈ ہٹنگ بیٹسمین بنوں اور دوسری خواہش تھی بلکہ تمنا تھی کہ امتیاز کی طرح ائرفورس میں چلا جاؤں۔

بابا سے مخفی رکھ کر پائلٹ بننے کی تیاریاں شروع کر دیں، ان دنوں زیادہ تر امتحان اور ٹیسٹ اینگل روڈ پر واقع ائرفورس کی آفس میں ہوا کرتے تھے اور جو امیدوار منتخب ہوتے تھے ان کو بس فائنل انٹرویو کے لئے رسالپور بلایا جاتا تھا۔

تو رسالپور سے انٹرویو کا لیٹر آ گیا راز افشاں ہو گیا۔ امی دہاڑیں مار کر رو پڑیں بالکل اسی طرح جیسے جہاز چلاتے ہوئے میں حادثے کا شکار ہو کر مر گیا تھا اور میری لاش گھر لائی گئی ہو۔ ابو نے یہ کہہ کر صاف انکار کر دیا کہ جب تک تیری ماں نہیں مانتی میں والدین کی طرف سے اقرار نامے پر دستخط نہ کروں گا۔ ان دنوں ابو (قاضی عبدالغنی) سندھ پبلک سروس کمیشن میں سیکرٹری کے عہدے پر فائز تھے۔ آفس کے علاوہ بھی آدھی رات تک گھر میں کام کیا کرتے تھے۔ ان کو کسی بھی قسم کا گھر

میں شور وغل، تنازعہ یا ہل ہنگامہ پسند نہیں تھا۔

انٹرویو کی تاریخ نکل گئی میں رسالپور جا نہ سکا۔ تمناؤں کے آئینے سے مرا عکس نکل گیا میں نے کالج جانا چھوڑ دیا، کرکٹ کھیلنا بھی ترک کر دیا، سودائی ہو کر کراچی کے راستوں پر بھٹکنے لگا۔ اچانک سب کچھ میرے لئے بے معنی سا ہونے لگا، بالکل بے مقصد خالی خالی۔۔۔۔

اصل میں امتیاز احمد میری زندگی کا پہلا ہیرو تھا۔ ان کی چال مجھے پسند تھی میں ان کی طرح چلنے لگا، ان کی طرح بالوں کو رکھنے لگا اور ان ہی کی طرح کپڑے پہننے شروع کئے مگر میں امتیاز کی طرح نہ ائرفورس میں جا سکا نہ ہی ٹیسٹ وکیٹ کیپر بن سکا۔

میری حالت زار سے ابو بہت پریشان ہوتے تھے۔ مگر امی فقط رویا کرتی تھیں مجھے گلے لگا کر پیار کرتی تھیں۔ آخر ابو کے دوست ڈاکٹر جیسانی، چچا فاروقی، چچا نظامانی درمیان آئے اور بات چیت ہوئی، بلا آخر فیصلہ یہ ہوا کہ چونکہ مجھے آخری مرحلہ پر پائیلٹ بننے سے روکا گیا تھا لہذا میرا ردعمل فطری تھا اور میں نے ردعمل کے طور پر انجینئر بننے سے انکار کر دیا تھا اور انٹر سائنس کا امتحان بھی نہ دیا، اس کے علاوہ میں نے کراچی میں رہنے سے انکار کر دیا۔

سب نے سمجھایا تو بات میری سمجھ نہ آئی میں بنباس سے تو واپس آ گیا مگر میں نے دو ضد پکڑ لیں۔ بلکہ اٹک گیا کہ سائنس کی بجائے آرٹس پڑھوں گا اور کراچی میں نہ رہوں گا۔ ان دنوں گورنمنٹ کالج نوابشاہ نیا نیا کھلا تھا، کالج کے پرنسپل پروفیسر احمد سعید ابو کے دوست تھے۔ ابو نے پروفیسر احمد سعید کو ساری صورتحال سے واقف کیا۔ انہوں نے نہ فقط مجھے انٹر آرٹس میں داخلہ دینے کا وعدہ کیا بلکہ مجھے اپنے پاس ایک وارڈ کی حیثیت سے رکھنے کی حامی بھر لی۔

میں سمجھتا ہوں کہ جون یا اگست کا مہینہ تھا اور سال 1955 کی بات ہے کہ میں نے زندگی میں پہلی دفعہ نوابشاہ دیکھا۔ ٹانگہ کر کے میں حامد علی کلب کے گیسٹ ہاؤس کی طرف روانہ ہوا جہاں پروفیسر احمد سعید اکیلے رہا کرتے تھے ان کی فیملی کراچی میں ہی تھی۔ بڑی گوم جوشی سے ملے اور رہنے کے لئے اسی گیسٹ ہاؤس کا ایک کمرہ دے دیا۔

پروفیسر احمد سعید انگریزی کے استاد تھے۔ انگریزی ادب پڑھتے پڑھاتے وہ خود آدھے انگریز بن گئے تھے جسے دیسی انگریز کہنا چاہیے۔ وہ ابلے ہوئے کھانے کھاتے تھے اور مجھے بھی کھلاتے تھے۔ میں نے زندگی میں پہلی اور آخری دفعہ ابلی ہوئی بھنڈی پروفیسر احمد سعید کے پاس کھائی تھی۔

کراچی کے مقابلے میں نوابشاہ اس قدر مختصر اور سونا سونا سا لگا کہ دل اداس ہو گیا کئی دفعہ خیال آیا کہ واپس چلا جاؤں۔ مگر کس منہ سے! میں تو بڑے دعوے سے کراچی سے روانہ ہوا تھا اگر اب واپس گیا تو ہنسے گے نہیں۔ میرا مذاق نہ اڑائیں گے! میں نے واپس جانے کا خیال دل سے نکال لیا اور ایک عرصے تک اور پھر راتوں کو تکیے میں سر دے کر چھپ کر رویا کرتا تھا۔

میں آوارہ، برنس روڈ اور بوہری بازار کے چٹخارے اور چٹپٹے کھانوں کا عادی ابلے ہوئے کھانے کھا کر بیزار ہو گیا، آخر میں نے کھانا کھانا چھوڑ دیا۔ جب بھوک زیادہ تنگ کرتی تو بسم اللہ اور سبحان اللہ نامی ہوٹلوں سے جا کر کھانا کھا لیتا۔ مجھے پکوڑے پسند ہیں۔ اسٹیشن کے قریب ایک حلوائی بہت اچھے پکوڑے بناتا تھا میں نے اپنے کمرے میں پکوڑوں کی ذخیرہ اندوزی شروع کر دی۔ پکوڑوں کی خوشبو سے ہی پروفیسر احمد سعید نے بھانپ لیا تھا کہ میں کسی صورت بھی انگریز نہیں بن پاؤں گا اور نہ ابلی ہوئی بھنڈی اور ٹینڈے کھا سکوں گا۔ تو میری بہبود کے لئے انہوں نے دو کام کئے۔ پہلا تو یہ کہ ہیڈ ماسٹر سائیں ایچ ایم خواجہ صاحب کو کہہ کر انہوں نے مجھے اسکول ہاسٹل سے کھانا کھانے کی اجازت دلوائی اور دوسرا مجھے جھاڑیوں سے بھرا میدان دکھا کر کہا کہ اسے کرکٹ گراؤنڈ جیسا بنا کر اپنے کالج کی ایک کرکٹ ٹیم بنالوں۔

گورنمنٹ کالج کی اپنی عمارت نہ تھی۔ کالج لوکل بورڈ اسکول کے ایک حصے میں شام سے رات نو بجے تک لگتا تھا۔ اب شام کا انتظار بیزار کر دیتا تھا۔ ویسے بھی گرمیوں کے دن طویل اور تپتے ہوئے نہایت گرم ہوتے تھے۔ میں نے ایک دو موسم گرما روہڑی کے بھی بھگتے مگر نوابشاہ کی گرمی کا کیا کہنا! زندگی کا کاروبار اس قدر بے مقصد اور بے معنی ہو گیا تھا کہ اس بے رونق بیزاری نے مجھے

ان کے صحیح مفہوم سے آشنا کر دیا۔ دن کاٹنا مشکل ہو جاتا تھا کہ گذرتا ہی نہیں۔

دوسری طرف کمرے میں ناشتہ کرنے کے بعد پروفیسر احمد سعید درجن بھر اخبارات، رسالے اور کتابوں کے انبار اٹھا کر بیٹھ جاتے تھے۔ دوپہر تک بیٹھے پڑھتے اور نوٹس لکھتے رہتے تھے مجھے پڑھنے سے بخار چڑھتا تھا مگر تنگ آ کر میں نے بھی پڑھنا شروع کیا۔ کچھ اخبارات اور رسالے تو پروفیسر احمد سعید مجھے خود دے جاتے تھے۔ دوپہر تک یہ پڑھنے کے بعد پھر پروفیسر احمد سعید کے ساتھ ابلے ہوئے کھانے کھانے پڑتے تھے۔

دوپہر کو سونے کی عادت مجھے نوابشاہ میں پڑی۔ دوپہر کا کھانا کھا کر دو تین گھنٹے نیند کرنا اور پھر جھاڑیوں والے میدان کی کٹائی صفائی کر کے جو کرکٹ گراؤنڈ بنایا تھا اس پر جا پہنچتا۔ اور پھر کھلاڑی پہنچنا شروع ہوتے۔ جمال دوست محمد چنا، دو بھائی تھے یہ میرے نوابشاہ میں پہلے دوست بنے۔ دوست محمد چنا حیرت انگیز باتیں کرتے تھے لیفٹ آرم فاسٹ باؤلر۔ سندھ پرازل سے وڈیروں اور جاگیرداروں نے حکومت کی ہے ڈاکو، خونی، لٹیرے اور جرائم پیشہ لوگ ہمیشہ ان کی پناہ میں رہتے تھے اور بدمعاش پولیس اہلکار، کامور اشاہی بھی انہی کی نگہبانی میں پرورش پاتے تھے۔ ''دوست محمد چنا کے اندر ان کے لئے بڑی نفرت اور بغاوت کی آگ بھڑکتی تھی۔ وہ مجھے اکثر کہا کرتا تھا کہ تم سپیریئر سروسز میں امتحان پاس کر کے کمشنر بن جاؤ یا DIG یا IG ہونا اور تم مجھ کو پناہ دینا میں چن چن کر وڈیروں سے کسانوں اور مظلوم عورتوں پر کئے گئے مظالم کا بدلہ لوں گا۔ رابن ھڈ کی طرح انہیں لوٹ کر ان کی دولت غریبوں اور مظلوموں میں تقسیم کروں گا۔

میں تو سپیریئر سروسز میں جا نہ سکا پر دوست محمد چنا پولیس میں جا کر اے ایس آئی بن گئے اور ان جاگیرداروں کے سر کا درد بن گئے۔ ایوب خان کا دور تھا ایک اشتہاری قاتل کو کراچی میں واردات کرتے ہوئے پکڑ لیا لا کر نبی بخش تھانے میں لاکپ کر کے ایف آئی آر کاٹ لی۔ ملک کے مشہور سیاستدانوں اور کامور اشاہی نے اسے ایف آئی آر پھاڑ پھینکنے کو کہا مگر یہ نہ مانا۔ پھر جیسے ہوتا ہے ایک جھوٹے کیس میں پھنسا کر اسے معطل کر دیا۔ تو یہ دوست محمد چنا نہایت طاقت ور ورزشی اور

ہینڈسم لیفٹ آرم بالر تھے جو اگر کراچی میں ہوتے تو ٹیسٹ کرکٹر ہو جاتے۔ اس طرح ناصر اور مشتاق بھی فاسٹ باؤلر تھے۔ قد و قامت اور دوڑنے کے انداز سے اسے دوست گھوڑا کہہ کر بلاتے تھے۔ علی محمد، گوہر شہمیز اور دوست محمد انزا اچھے بیٹسمین تھے۔ نور احمد آل راؤنڈ تھے۔ ٹیم میں ایک ایسا بھی کھلاڑی تھا جس نے آگے چل کر میرا زندگی کی طرف رویہ اور رجحان بالکل بدل کر رکھ دیا۔ میں اس ایک شخص سے ملنے کے بعد وہ نہ رہا جو ہوا کرتا تھا۔ اس کا نام تھا قمر شہباز۔

ہفتے میں ایک شام ایسی بھی آئی جب قمر شہباز مجھے پابندی سے سندھی ادبی سنگت کی نشست میں لے جاتے تھے۔ اب وہ جگہ مجھے پوری طرح یاد نہیں ہاں وہ جگہ حکیم معاذ دواخانہ کے سامنے ہوا کرتی تھی۔ شروع شروع میں تو کہانی اور نظموں پر تبصرے سن سن کر مجھے عجیب سا لگتا تھا۔ وہ ایک نئی اور نرالی دنیا لگتی تھی، جس میں پہنچ گیا تھا تو مجھے پتہ نہیں لگا کہ اس ادبی سنگت کی نشستوں میں پڑھتے ہوئے الفاظ کی بے پناہ قوت میرے وجود میں ایک انوکھے سفر کے آغاز کا سبب بن رہی تھی۔ تو اس طرح بے خبری اور لاشعوری طور پر میں اس کارزار میں وارد ہوا جو انسان ذات کی پوری تاریخ پر محیط ہے، چھایا ہوا ہے۔ میرا پہلا ردعمل حیرت تھی، کہانی اور شاعری سن کر اور پڑھ کر میں حیران ہوتا تھا اور آج تک حیران ہوں۔

کرکٹ سے تو میرا عشق تھا اور وہ عشق آج بھی پہلے پیار کی طرح میری زندگی میں موجود ہے۔ عام مفہوم میں لوگ جسے تفریح کہتے ہیں میری زندگی میں عدم موجود تھی ماسوائے انگریزی فلموں کے جو میں دیکھا کرتا تھا خاص طور پر وہ جن میں برٹ لینکاسٹر، جیمس اسٹوئرڈ، جیمس میسن، مارلین برانڈو، گیری کوپر اور مانٹگمری کلفٹ ہوتے تھے۔

تو یہ کچی چھوٹی سی غیر معروف گھٹن والی جگہ جس میں ادبی سنگت کی نشستیں ہوا کرتی تھیں میری شمولیت کے وقت کبھی سوچا نہ تھا کہ چند سالوں بعد جب وجود کی بے مقصدیت کا مطلب سمجھ میں آئے گا تو میں خود لکھنا شروع کروں گا۔ ایک لمحے کے لئے بھی نہ سوچا تھا کہ میرا پہلا پیار کرکٹ بھی کائنات ادب میں مجھے نئی معنی اور تشریح سے نظر آئے گا۔

ایک دفعہ سائیں خوجا صاحب کو عرض کیا کہ سائیں جب آپ نے مجھے ہاسٹل میں کھانا کھانے کی اجازت دی ہے تو اب ہاسٹل میں رہنے کی بھی اجازت دے دیں۔ کچھ دیر تک سوچتے رہے اور بولے ہاسٹل اسکول کے طالب علموں کے لئے ہے اور تم کالج میں پڑھتے ہو ہاں میں یہ کرتا ہوں کہ لطیف ہال کا گرین روم تمہیں دے دیتا ہوں۔ جب تک نوابشاہ میں ہو وہیں رہو۔

سائیں خوجا صاحب نے لطیف ہال کے نام سے ایک عالیشان آڈیٹوریم تعمیر کروایا تھا۔ جب میں کراچی چھوڑ کر نوابشاہ پہنچا تھا تو ہال تکمیل کے آخری مراحل میں تھا۔ میرے سامنے ہی ہال مکمل ہوا۔ اس ہال میں میں نے ایک غیر ملکی پروفیسر کا حیرت انگیز لیکچر سنا۔ عنوان تو اب مجھے صحیح طرح یاد نہیں یہ بیالیس سال پرانی بات ہے۔ موضوع کا تعلق انسان میں حیوانی جبلتیں موجود ہونے سے تھا۔ پتھر کے دور سے آج کی صدی تک دو عالمی جنگیں ہوئیں جس میں انسان کے ہاتھوں انسان پر جو تباہیاں اور وحشت ناک وارداتیں کی گئیں موت اور تباہی کے منظر تاریخی دستاویزات کے ساتھ سلائیڈز کے ذریعے نقشوں اور ڈرائینگ کی مدد سے پیش کئے گئے۔ انسان کے منہ میں موجود بتیس دانت جن کی ساخت مختلف جانوروں کی دانتوں سے مشابہ کر کے دکھائی گئی جو میں آج تک نہیں بھول سکتا۔ انسان کی بتیس دانتوں میں کچھ دانت ہو بہو بھیڑیئے جیسے، کچھ شیر جیسے اور داڑھیں بھینس بکری جیسی ساخت کی دکھائی گئی۔

مجھے اندھیرا ہمیشہ پراسرار دکھائی دیتا ہے۔ لطیف ہال کے ایک طرف جہاں گرین روم ہوتا تھا گھنے پیڑ اور گہرا اندھیرا ہوتا تھا۔ اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں اکیلا تن تنہا اس ہال میں رہتا تھا۔ آدھی آدھی رات تک جاگا کرتا تھا۔ کبھی کبھی تو پوری رات سو نہیں سکتا تھا۔ تیز چلتی ہوئی ہوائیں جب گھنے پیڑوں سے ٹکراتی تھیں تو عجیب سرسراہٹ ہوتی تھی اور لمبی لمبی ٹہنیاں جھوم جھوم کر کسی دیو کی مانند بال کھول کر رقص کرتی تھیں۔ اس کے ساتھ عجیب قسم کی آوازیں بھی سنائی دیتی تھیں اور کبھی کبھار تو دروازہ کھٹکنے کی بھی آواز آتی تھی بالکل صاف اور واضح کہ میں جواب دینے کو تیار ہو جاتا تھا کہ کون ہے؟

پتہ نہیں کیوں؟ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ اگر میں نے پوچھ لیا کہ کون ہے تو باہر سے جواب آئے گا میں تمہارا گذرا ہوا کوئی جنم ہوں۔

اب جب اپنی آتم کتھا لکھنے بیٹھا ہوں تو محسوس کرتا ہوں کہ گذشتہ بیس پچیس سالوں کے دوران لکھی ہوئی کچھ کہانیوں میں واضح طور پر پراسراریت کا براہ راست تعلق ان وحشت ناک اور پراسرار راتوں سے ہے جو راتیں میں نے لطیف ہال کے اس گرین روم میں جاگتے احساس کے بھیانک تصور میں اندھیرے جنگل میں بھٹکتے ہوئے گذار دیں تھیں۔ انہی راتوں کے سائے اپنی مکمل معنویت کے ساتھ مجھے اپنی پچھلی کہانیوں میں نظر آتے ہیں۔ "عاشق موتي ايندا آهن" "گهاءُ" "رني کوٽ جو خزانو"، "کيپل ٻاهن جو وارث" "نيون وجود" "جنم" اور تازہ شائع کی گئی انگریزی کہانی ورٹیگو جس کو دوبارہ سندھی میں لکھوں گا کب؟ کچھ پتہ نہیں پہلے وقت اپنے بس میں ہوتا تھا اب میں وقت کے بس میں ہوں۔ سمجھتا ہوں کہ کئی ایک کہانیاں ہیں جن میں اس تصور اور شعور کے سفر کا ذکر ملتا ہے مگر نام یاد نہیں آتے۔۔۔۔

ایک دفعہ سائیں ایچ ایم خواجہ صاحب کے پاس بیٹھے تھے۔ ادب کے متعلق بات چیت ہو رہی تھی۔ سائیں نے اپنے پسندیدہ ادیبوں میں ہال کین کا نام لیا اور خاص طور پر زور دیا۔ آگے چل کر چند سالوں بعد غالباً انیسو ساٹھ یا باسٹھ کے درمیاں میں نے ادب میں سنیاس لے لیا۔ بڑی پابندی سے پڑھنا شروع کیا کچھ قلم کاروں نے میرا اندراجا گر کر دیا کچھ سمجھ میں نہ آئے۔ ہال کین کی کتب تھامس اینڈ تھامس بک سیلرز کے مالک نذیر احمد نے باہر سے منگوا دی ورنہ ہال کین کے نام سے دوکاندار واقف تک نہ تھے۔

سائیں خوجا صاحب کی شفقت، محبت اور پیار کے ساتھ ہال کین کا حوالہ میں آج تک بھلا نہ پایا ہوں۔ جن ادیبوں سے میری ذہنی ہم آہنگی ہوگئی میں انہیں بار بار مقدس کتابوں کی طرح پڑھنے لگا۔ ان سب میں کہانی شروع کرنے کا ٹکنیک ہال کین کے پاس بڑا سحر انگیز دلکش اور حیران کن ہے۔

کچھ ادیب ہمیں متاثر کرتے ہیں کچھ کر نہیں پاتے، جو قلم کار ہمیں متاثر نہیں کر پاتے وہ لازم نہیں کہ وہ بڑے پائے کے ادیب نہ ہوں، ساری بات تو ذہنی ہم آہنگی کی ہوتی ہے جو ادب ہم پسند کرتے ہیں ان سے ہماری ذہنی ہم آہنگی ہوتی ہے۔ اردو ادب میں کوشش کے باوجود میں منٹو کو نہیں پڑھ پایا اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ کرشن چندر کے مقابلے منٹو کوئی کم درجے کا ادیب ہے۔ ہرگز نہیں بات صرف اتنی ہے کہ کرشن چندر کے ساتھ اپنی ذہنی ہم آہنگی پیدا ہو گئی ہے اور منٹو سے ذہنی ہم آہنگی پیدا ہو نہیں پائی ہے۔

میرے خیال میں تقسیم کے موضوع پر لکھی ہوئی کہانی ٹوبہ ٹیک سنگھ نہایت زبردست کہانی ہے۔ اسی طرح بنگالی ادب میں ٹیگور کے مقابلے میں ناول دیوداس کے ادیب شرت چندر سے میں نے بھرپور ذہنی ہم آہنگی محسوس کی ہے۔

ہال کین مجھے بے حد پسند ہے جن کے ناول میں بار بار دھرا کر پڑھتا ہوں۔

1956 میں ہم سب دوستوں کے لئے ایک سانحہ رونما ہوا جس نے سب کو ہلا کر رکھ دیا۔ ہم سب کا دوست عبدالمالک جس کو نوابشاہ کے سارے لوگ ادا کہہ کر بلاتے تھے لطیف ہال کی اسٹیج سے امتیاز علی تاج کے ڈرامے انارکلی میں سلیم کا کردار کرتے ہوئے گر پڑے۔

ہسپتال لے گئے۔ دو دن کے بعد ہوش میں آئے، سخت بخار میں مبتلا تھے، ہم ملنے گئے۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی مگر جانبر نہ ہو سکے اور کچھ دنوں بعد چل بسے۔

میں نے ادا سے زیادہ محبت کرنے والا شخص، ایسا پرخلوص دوست آج تک نہیں دیکھا، ہینڈسم جیسے دلیپ کمار، گیت غزل گاتے تھے۔ ان کی آواز طلعت محمود سے مشابہ تھی۔ اوپننگ بیٹنگ کرنے جاتے تو لگتا تھا حنیف محمد سے آگے جائیں گے، مگر سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں ہی چل بسے۔ ان کی یاد کو تازہ رکھنے کے لئے گل محمد چنا، قمر شہباز اور شمشیر الحیدری نے ایک رسالہ نکالا ''ادا''

تمام دوستوں کو خاص طور پر جو ان کے زیادہ قریب تھے تاکید کی گئی کہ پہلے شمارے کے لئے

لکھیں۔ میں نے قمر کو کہا ''یار یہ کام مشکل ہے میں لکھ نہیں پاؤں گا اور پھر اگر لکھوں تو کیا لکھوں؟''

قمر نے کچھ اس طرح مجھے بارگاہ ادب میں لا کھڑا کیا کہ کسی کے متعلق کوئی یا دایسی جو تم کبھی بھلا نہ سکو وہ لکھو۔''

اور میں نے لکھی اپنی پہلی کہانی جس کا عنوان دیا ''اندرا'' اور موضوع تھا ایک مسلمان نوجوان جو ایک ہندو لڑکی اندرا کے لئے بیراگ لیتا ہے، وہ جو تقسیم ہند کے وقت ہندوستان چلی گئی۔ اس مسلمان لڑکے نے اس کے بیراگ میں مذہب پر محبت کو ترجیح دی۔ ہنگامہ ہوا۔

پہلی کہانی نے آنے والی کہانیوں پر ابتدا سے ہی شہادت دے دی۔ وہ کہانی شائع ہوئی اگست 1956 میں اور شہر تھا نوابشاہ۔

ادب کی انوکھے اور وشال کائنات میں کھو کر رہ جاؤں گا۔ اس طرح کہ کرکٹ میں مجھے کہانیاں نظر آنے لگیں۔ کرکٹ کے علاوہ مجھے فٹ بال، باکسنگ اور اتھلیٹکس بھی بہت زیادہ پسند تھیں، ہر کھیل میں اب مجھے نئے معنی اور مفہوم نظر آنے لگے۔ گول کیپر میرے لئے ایک علامت بن گیا اور ایسے اکیلے انسان کی علامت جس پر مخالف سائیڈ کے فارورڈ چیتے کی طرح حملہ کر دیتے ہیں اور کوئی بھی ساتھی اس کی مدد کو نہیں آتا۔

اس طرح پھر نئے معنی اور مفہوم اور نئی تشریح کے ایک کے بعد دوسرے در کھلتے گئے۔ دل تھام کر جب اس در سے داخل ہوتا تھا تو نئی حیرت اور تجسس کی دنیا میں جا نکلتا تھا۔ کبھی کبھی مجھے میری ذہنی کیفیت ٹھیک معلوم نہیں ہوتی تھی، نیند اڑ جاتی تھی آسمان پر آنکھیں ڈال کر تصدیق کی تلاش میں رات کاٹ دیتا تھا۔ لطیف ہال کی کھڑکی سے کسی کسی وقت آسمان مجھے آسمان نہ لگتا تھا، آسمان پورا خلا میں اڑتا ہوا سمندر دکھائی دیتا تھا جو میرے سر پر چنگھاڑ رہا تھا اور ستارے کئی کشتیوں کی مانند جھومتے دکھائی دینے لگے تھے۔

اور پھر انہیں دنوں سیاست میرے آگے ایک بدصورت ڈائن بن کر بدنما برہنہ ہو کر سامنے آ

کھڑی ہوئی۔ معناؤں اور مفہوم کے کچھ نئے در وا ہو گئے۔ وَن یونٹ بن گیا۔ سندھ، سندھ کی بجائے ایک سابق صوبہ بن گیا۔ بڑی تحریک چلی، ہنگامے ہوئے اتنی ہلچل ہوئی کہ صدیوں کے سوئے ہوئے ارواح جاگ گئے۔

سال تھا انیس سو چھپن مہینہ تھا ستمبر یا اکتوبر کا ون یونٹ کے خلاف مزاحمت اور احتجاجی جلسے کا پروگرام بنایا گیا میں نے پوری زندگی میں سیاسی جلسے میں شرکت نہیں کی نہ سیاسی جلسہ دیکھا تھا، میں تو ایک اجنبی کی طرح تیاریاں دیکھ رہا تھا۔

اسکول کالج اور یونیورسٹی کے دوستوں کو چھوڑ کر شاید ہی کسی کو پتا ہو کہ میں سریلے انداز میں گا بھی سکتا ہوں۔ خاص طور پر ماسٹر چندر اور محمد رفیع کے گیت۔ مزاحمتی جلسے کے لئے قمر شہباز نے ایک گیت لکھا تھا۔

وطن کی راہ میں وطن کے جواں شہید ہوں
یا بچائیں سندھ کو یا سورمے شہید ہوں

فیصلہ یہ کیا گیا کہ قمر شہباز کا گیت جلیل گائے گا اور میں نے حامی بھر لی۔ ایک چوراہا تھا مونی بازار یا اسٹیشن روڈ پر۔ میں نے سمندر دیکھا تھا مگر زندگی میں پہلے لوگوں کا ایسا سمندر نہیں دیکھا تھا۔ دل کانپ اٹھا، کنپٹی سے پسینہ بہنے لگا۔ میں گاتا تھا تو دوستوں کی مختصر محفل میں، کبھی اسٹیج پر بھی نہیں گایا تھا۔ انسانوں کا سمندر، جوش، جنون، مرنے مارنے پر تلے ہوئے لوگ یہ آتش فشاں دیکھ کر میرا گلہ خشک ہو گیا سر اور آواز گلے میں اٹک گئی۔ ٹانگیں کانپنے لگیں، پتہ نہیں پھر کسی نے میرے ہاتھ میں مائیکروفون پکڑایا ار کہا گاؤ۔

پھر مسلسل آوازیں آتی رہیں، گاؤ، گاؤ، گاؤ اور اچانک خاموشی چھا گئی اور مجھے اپنی آواز سپیکر سے سنائی دی۔

وطن کی راہ میں وطن کے جواں شہید ہو
یا بچائیں سندھ کو یا سورمے شہید ہو

مجھے قطعی یاد نہیں کہ جلسے میں کون کون سے نامور سیاستدان شریک ہوئے۔ قاضی فیض محمد بڑے نام والے سیاستدان تھے۔ مشرقی پاکستان کے بھاشانی گروپ والے سیاستدانوں کے دوست تھے، نوابشاہ میں رہتے تھے۔ مزاحمتی جلسے میں قاضی صاحب اور مشرقی پاکستان کے سیاستدان تھے۔ یاد نہیں کیسے میں نے کانپتے ہوئے وہ گیت پورا کیا۔ مائیکروفون لوٹا کر جلسے سے رفو چکر ہوا۔

جلسہ چلتے پولیس اور مظاہرین میں دوبدو جنگ ہوگئی۔ ٹیئر گیس گولیاں اور پتھر برسائے گئے۔ لاتعداد لوگ زخمی بھی ہوئے کچھ شاید مر بھی گئے۔ ریلوے اسٹیشن پر گاڑیاں روک کر ون یونٹ کی خبر لئے ہوئے اخبارات کے بنڈل اتارے گئے۔ جلائے گئے۔

نوابشاہ میں گرفتاریاں شروع ہوگئیں۔ راتوں رات قمر شہباز اور دوسرے دوست انڈر گراؤنڈ ہوگئے۔ دوسری صبح ایس پی رئیسانی نے بڑے اٹالے سے آکر مجھے گھیرا۔

پولیس وین کی بجائے اپنی جیپ میں بٹھایا۔ میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''قاضی عبدالغنی کے بیٹے ہو؟''

ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا ''ہاں''

''میں نے قاضی صاحب کو فون کر دیا ہے''۔ ایس پی رئیسانی نے کہا۔

''ہم تمہیں کراچی بھیج رہے ہیں''۔

مجھے تعجب ہوا۔

اسٹیشن پہنچ کر ایس پی رئیسانی نے ایک اے ایس آئی کو کچھ ہدایات دیں مجھے جیپ سے اتار کر گو مجوشی سے ہاتھ ملایا اور کہا کچھ عرصے تک نوابشاہ نہ آنا، تمہاری گرفتاری کے وارنٹ نکلے ہوئے ہیں۔

رئیسانی چلا گیا۔ سپاہی مجھے اسٹیشن لے آئے، گاڑی آئی مجھے پولیس کمپارٹمنٹ میں بٹھایا اور ایک اے ایس آئی کے حوالے کر دیا۔

ایک گیت کی سزا گرفتاری!

چھ مہینے غائب رہنے کے بعد میں انیسو ستاون کے پہلے مہینوں میں نوابشاہ واپس آ گیا۔ اس سال سندھ یونیورسٹی کی طرف سے کھیلتے ہوئے پشاور یونیورسٹی کے دس کھلاڑیوں کو وکٹ کیپنگ کرتے ہوئے آؤٹ کیا۔ چھے پہلی اننگ میں چار اور دوسری اننگ میں۔ چالیس سال بیت گئے ہیں۔ مجھے نہیں پتہ کہ وہ میرا وکٹ کیپنگ کا ریکارڈ انٹر یونیورسٹی میں کسی نے توڑا یا اب بھی قائم ہے۔

نوابشاہ میں مجھے مہربان و شفیق تعلیمی ماہر سائیں ایچ ایم خواجا ملا، نوابشاہ ہی میں مجھے قمر شہباز ملا جس نے ہاتھ پکڑ کر مجھے بارگاہ ادب میں لا کھڑا کیا۔ نواب شاہ میں مجھے دوست محمد چنا ملا لیفٹ آرم پیسر، فاسٹ باؤلر جس کی حیرت انگیز باتوں نے میرے آگے سماجی، معاشرتی اور طبقاتی سچائیوں کے نئے باب کھول دیئے۔ دوست محمد چنا۔ میں، میں نے ایک Lonely Wolf دیکھا۔ ایک اکیلا لڑاکو اور میں بھی خود ایک Lonely Wolf ہو گیا۔

میں نے نہ لینن کو پڑھا ہے نہ مارکس کو۔ میرا لینن مارکس دوست محمد چنا ہے۔ میرے کچلے، روندے، ڈرے اور سہمے ہوئے کرداروں کے پیچھے دوست محمد چنا کے ساتھ بیتے ہوئے وہ لمحات ہیں جس میں میں نے ڈاکوؤں اور پولیس کے رونگھنے کھڑے کرنے والے ظلم و جبر کی وہ زندہ روداد یں سنیں جن کو سننے کے بعد میں بھی ایک Lonely Wolf بن گیا اور اس اکیلے لڑاکو بننے کے قدیم آثار دکھائی دیتے ہیں۔

میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ نواب شاہ میں گذارے ہوئے میرے وہ تین سال اگر میری زندگی سے نکال دیئے جائیں تو اس ساٹھ سالہ زندگی میں کچھ باقی نہیں بچے گا۔

Amar Jaleel

To Kill Hemingway

Sudden burst of social, Political, and historical events enlightened me. I felt abundantly motivated to bring about a positive change in my life of a nonconformist. I, an avowed sinner, and a man without virtues was unexpectedly provided with an apportunity to disassociate with my errant past, and become a pious man by killing an American. The mullas had convinced me if I killed an American my wicked life would turn into the life of a pious person. If in the process of killing an American I lost my life I would attain martyrdom. The martyrs instantly end up in heaven among the beautiful nymphs who serve them with grapes and heavenly wine, and provide them all conceivable comforts otherwise denied to them on earth.

The soul-stirring sermons of the mullas transformed the wayward person within me into a warrior of Allah. They paved the way for lofty ideals in my ignorant life. Before embarking upon my noble mission I enquired from my mo'alum (a teacher who teaches religion)," I am a penniless person. How am I to reach America to kill an American?"

"It is not necessary for you to go to America for killing an American." The mo'alum replied."Many Americans live in Karachi."

I felt confused, and asked, "Am I not supposed to kill an

American soldier?"

" You have to kill an American." The mo'alum replied, "It doesn't matter if the slain American is a soldier or a civilian, man or a woman, young or an old. Your scared duty is to kill an American,"

My confusion was removed, I decided to kill an American."

I thought of eliminating Paja Masih. He is personally known to me. By virtue of his nationality he is an Amercian. He was born at Rawalpindi, and was brought up in New Jersey. Paga Masih cleans the lavatories at the American Consulate in Karachi. I purchase liquor from him.

It seemed relatively easy for me to kill Paja Masih. But, somehow I changed my mind. There was no sense in killing a person who did not look like an American. Paja Masih was swarthy, short in stature, and weak. In phsique and figure he did not appear an alien. He was like us. I therefore thought of killing a genuine American, tall, tough, rough, and white. They work at UN office, UNESCO, UNDP and US Information Centre. I perpared a tentative inventory of the original Amercian employees, and kept vigil on their movements.

No doubt I am a sinner, a man without virtues, but never before in my life have I ever terminated the life of a person! I kept tossing between a firm dicision, and indecision. Deep down the idea of killing a person perturbed me. However, the temptation to end up in heaven among the nymphs was more alluring. I realised what contributed to my wavering approach to a noble cause was the foolproof security arrangement at the UN,

UNESCO, UNDP offices, and American Information Centre and the Consulate. It was impossible to carry a weapon there without being detected. Redemption for a sinner seemed farfetched idea.

I was almost on the verge of giving up my noble mission when the voice of the pious mullas echoed in my ears, "Remeber, it is an opportunity of a lifetime for your redemption. You must kill an Amercian."

Queer experience of listening to an echo left me bewildered. I decided to seek guidance from one of my learned friends, Dost.

"Dost," I asked, "Is it all right if I killed Paja Masih for my redemption?"

"Don't kill a nonentity," Dost said, "Go, and kill a well known American, a celebrity. It will redeem you from your countless sins."

I thanked Dost, and sought his permission to leave.

He said, "Refrain from killing Mohammad Ali, the boxer."

I emerged more assured, and more confident, and I decided to kill a famous American. Thereafter, I indulged in an intricate monologue to decide upon the name of my would-be victim, a famous American. Marlon Brando! Anthony Quinn! Kirk Douglas! Gregory Peck! Burt Lancaster! Charlton Heston, Clint Eastwood, Von Dam, and that one-man army called Sylvester Stallone! I realised, they all belonged to show-biz, and it won't be of any consequence if I killed an actor.

I thus decided to kill some other kind of a famous Amercian. George Washington! He is already dead. Abraham Lincoln! He was assassinated long ago. John F Kenndy! He too has been

killed. Then, Martin Luther king! He was murdered. I felt frustrated. I therefore thought of killing an American who happens to be a man of letters, a short story writer, a novelist, a poet. It turned out to be an intriguing task.

My study of American literature is meagre. I know no famous names in Amercian literature. While I scratched my head it occured to me I better consult Aaqil Khan, retired primary teacher who because of pecuniary hardships has gone berserk. People believe he has digested American literature.

"Sir" I asked, " Who is your favourite writer in American literature?"

Surprised, Aaqil Khan looked at me, and said, " What are you up to, Gumrah!"

"Sir please," I said , " Let me know the names of a few famous American writers."

Aaqil Khan smiled, and said, "Well, Herman Melville is a very famous Amercian writer."

"Where can I find him?" I asked abruptly.

He looked at heavens, and said,"Up, there!"

Embrassed, I asked, "Who else do you think are famous Amercian Writers?"

"William Sarroyan is a very famous writer." He said, " And for that matter T. S. Eliot, Mark Twain, Henry James, and John Updike are equally famous writers."

"Can I reach them?" I asked.

"Of course," He said, you can find them in any good library."

I hesitantly asked," Are they alive?"

"They never die." He said, " But , from your point of view they are dead."

"Someone else you think is very famous I asked. John Steinback and William Faulkner are very famous writers, but they too are dead." Aaqil Khan said, " The most charismatic Amercian writer famous throughout the world is Hemingway."

"Hemingway!" The name appeared familiar to me. I jumped to my feet, and said, " I know him."

"Thank God!" Aaqil Khan said,"You are aware of Hemingwey!"

"I know Hemingway very well, Sir" I shook hands with Aaqil Khan, and embarked upon my mission.

The name of the youngest son of Paja Masih is Hemingway. He is a cute little kid.

I kidnapped Hemingway on his way to the school, and took him to a deserted place.

He cried, and asked, "Why have you brought me here , Uncle? "

"I intend to kill you. "

"Why do you want to kill me?"

"Because, you are Hemingway."

"I am Hemingway," The boy wept, and asked, "But, what have I done?"

" Nothing"

"Then, why would you kill me?"

" I have to kill a famous American for redemption from my sins."

" I am not famous, sir."

" You are famous throughout the world, Ernest Hemingway."

"I am not Ernest Hemingway, sir."

" You are," I Shouted at him, and said, " Haven't you written novel 'Sun Also Rises?"

" No, I have not."

" And, Farewell to Arms?"

" No"

" Haven't you written novel ' for Whom the Bell Tolls', and ' Old Man and the Sea."

" How can I write several books when I am only six years of age?"

" You are lying Ernest Hemingway."

" I am Paja Hemingway," The kid wept and said, " Believe, me Uncle, I am not Ernest Hemingway."

I was taken aback.

The kid said, " I am Paja Hemingway son of Paja Masih."

I let Paja Hemingway go. I , a man without virtues was not destined for salvation. I remain a sinner. I could not become a warrior of Allah.

☆☆☆☆☆

امر جلیل (کالم)

سب جھوٹ

جو سوچتے نہیں، خوش رہتے ہیں

اللہ سائیں نے ہم آدمیوں کو ایک عدد سر سے نوازا ہے۔ اس سر میں اللہ سائیں نے ایک بھیجا بھی رکھ دیا ہے۔ آپ سوچ رہے ہونگے یہ کوئی اسپیشل عنایت نہیں ہے جس سے اللہ سائیں نے آدمی کو نوازا ہے۔ اللہ سائیں نے حیوانوں کو بھی ایک عدد سر دیا ہوا ہے۔ اور سر کے اندر ایک مغز بھی ہوتا ہے، یعنی بھیجا ہوتا ہے۔

انسان اور حیوان کے سر میں رکھے ہوئے بھیجے میں دو بنیادی فرق ہیں۔ ایک یہ کہ آپ بکرے، مینڈھے، گائے بیل وغیرہ کا بھیجا فرائی کر کے کھا سکتے ہیں۔ آپ انسان کا بھیجا کھا نہیں سکتے۔ انسان اور حیوان کے بھیجوں میں دوسرا بڑا فرق یہ ہے کہ حیوان بیچارا سوچ نہیں سکتا۔ اس کے برعکس انسان بیچارا سوچ سکتا ہے۔ یاد رہے کہ جو سوچ نہیں سکتے وہ بیچارے ہوتے ہیں۔ اور جو سوچ سکتے ہیں وہ ان سے زیادہ بیچارے ہوتے ہیں۔ انسان اور حیوان کے بھیجوں میں ایک تکنیکی فرق بھی ہے۔ اللہ سائیں نے انسان کے بھیجے میں ایک مائکرو چپ لگا دی ہے جو اسے سوچنے پر مجبور کرتی رہتی ہے۔ اللہ سائیں نے حیوانوں کو سوچنے والے مائیکرو چپ سے محروم رکھا ہوا ہے۔ کائنات میں توازن کے لیے یہ بہت ضروری تھا۔ ورنہ سوچنے والے انسانوں اور سوچنے والے حیوانوں کے درمیاں کبھی ختم نہ ہونے والی جنگیں ہوتی رہتیں۔ تب آپ کے لیے کسی جانور کو قربان کرنا یا کسی جانور کی قربانی دینا اسقدر آسان نہیں ہوتا۔ تب شاید حیوان بھی ایک عدد آدمی کو قربان کرنے پر بضد ہو جاتے۔ اب چونکہ آدمی سوچ سکتا ہے اور حیوان سوچ نہیں سکتا۔ اس لیے آدمی کا کام آسان کر دیا گیا ہے۔ وہ جب چاہے سوچ سے محروم کسی بکرے وغیرہ کو قربان کر سکتا ہے۔

خواتین خوامخواہ ناراض نہ ہوں۔ لفظ آدمی کا چونکہ مؤنث نہیں ہے اس لیے لفظ آدمی مرد اور

عورتوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ یہ گرامر کے مسائل ہیں۔ میری سمجھ سے بالاتر ہیں۔ حالانکہ میں نے جتنے الفاظ 'ی' پر ختم ہوتے ہوئے دیکھے ہیں وہ لامحالہ مؤنث ہوتے ہیں۔ مثلاً چارپائی، کرسی، گاڑی، چھپکلی، مرغی، مکڑی وغیرہ۔ یہ سب مؤنث ہیں۔ لیکن ی سے ختم ہونے والا لفظ آدمی زیادہ تر مذکر کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ میں نے آدمی میں خواتین کو بھی شامل کر دیا ہے۔

اس تمہید سے ہم نے یہ حاصل کیا کہ آدمی سوچ سکتا ہے۔ وہ اس لیے سوچ سکتا ہے کہ اس کے بھیجے میں مائیکرو چپ فٹ ہے۔ بکرے اور مینڈھے اس لیے نہیں سوچ سکتے کہ ان کے بھیجے میں مائیکرو چپ فٹ نہیں ہوتا۔

اللہ سائیں کے طرف سے ہم آدمیوں کے بھیجے میں لگا ہوا مائیکرو چپ ایک سا نہیں ہوتا۔ مثلاً سقراط اور البرٹ آئین سٹائین کے بھیجے میں غیر معمولی مائیکرو چپ لگا ہوا تھا۔ جڑواں بھائیوں کے بھیجے میں مختلف نوعیت کا مائیکرو چپ لگا ہوتا ہے۔ اس لیے جڑواں بھائیوں کی سوچ ایک دوسرے سے الگ ہوتی ہے۔ یہ بھی اللہ سائیں کے کرشموں میں سے چھوٹے سے کرشمے ہیں۔ یہاں رک کر ایک بات کا تجزیہ کر لیتے ہیں تاکہ موضوع کا تسلسل رواں رہے۔

آج کی بات چیت میں، میں اول سے اب تک محاورہ اللہ سائیں استعمال کر رہا ہوں۔ کہیں آپ یہ تو نہیں سوچ رہے کہ اللہ کے ساتھ صفت سائیں لگا کر میں نے اللہ کو سندھی بنا دیا ہے؟ نہیں، بھائی نہیں۔ یہ امکان سے باہر ہے۔ یہ ممکن ہے ہی نہیں۔ اللہ سندھی، پنجابی، پٹھان، بلوچ، مسلمان، ہندو، عیسائی، سکھ، پارسی، یہودی نہیں ہو سکتا۔ وہ ازل سے ایک ہے۔ تمام کائناتوں کا خالق اور مالک ہے۔ ہم کیڑے مکوڑے اپنے اپنے خول کے اندر، انیک فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ہم نے اپنے اردگرد حصاریں کھینچ لی ہیں۔ ایک دوسرے کے لیے اجنبی بن گئے ہیں۔ ہم نے سرحدیں کھڑی کر دیں۔ دنیا کو بانٹ کر اپنی اپنی دیواریں کھڑی کر دی ہیں۔ اسی طرح ایک خالق کو اپنی خام خیالی میں بٹی ہوئی دنیا کے ہم باسیوں نے آپس میں بانٹ لیا ہے۔ کوئی اسے کسی نام سے یاد کرتا ہے اور اس کا ذکر کرتا ہے، اور کوئی کسی اور نام سے۔ کچھ فرق نہیں پڑتا۔ وہ نہ تو تقسیم ہو سکتا ہے اور نہ بانٹا جا سکتا ہے۔ خالق کو آپ اللہ سائیں کہیں، اللہ تعالیٰ کہیں، اللہ میاں

کہیں، اللہ رب العزت کہیں، کچھ فرق نہیں پڑتا۔

جب ہم پوری دنیا کے لوگ اللہ سائیں کے بارے میں ایک سوچ نہیں رکھتے، تب یہ کیسے ممکن ہے کہ کسی اور بات پر ہم سب کی سوچ یکساں ہو؟ سیاسی، سماجی اور اقتصادی مسائل کے بارے میں ہم اپنے اپنے زاویے سے سوچتے ہیں۔ یہ ہنرمندی اس چھوٹی سی مائیکرو چپ کی وجہ سے ہے جو ہمارے بھیجوں میں مولیٰ نے فٹ کر دی ہے۔ کچھ لوگ ہمیشہ سا ہوکار یعنی دولت مند بننے کا سوچتے ہیں۔ اس کے علاوہ کوئی سوچ ان کے ذہن میں نہیں آتی۔ اسٹاک مارکیٹ سے کس کمپنی کے شیئر خریدیں، کس کے بیچ دیں۔ کنسٹرکشن کا کام کیسے شروع کیا جائے۔ برآمدات اور درآمدات میں کیسے الجھا جائے۔ پیسہ کیسے دوگنا، چوگنا، اور سوگنا کیا جائے۔ ان کا مقصد ایک ہی ہوتا ہے۔ دولت مند بننا۔ طریقہ کار ان کا مختلف ہوتا ہے۔

ملازمت پیشہ لوگ ہمیشہ ترقی کا سوچتے رہتے ہیں۔ باس کو خوش رکھنا۔ اس کی چاپلوسی کرنا۔ اس کا جاسوس بن کر دفتر میں دیگر ساتھیوں کی چغلیاں کھانا۔ دوستوں کا پتہ کاٹنا۔ ان کی سوچ کا حصہ بن جاتے ہیں۔

کچھ لوگ دن رات بچوں کے مستقبل کے بارے میں سوچتے رہتے ہیں۔

کچھ لوگ املاک بنانے کا سوچتے رہتے ہیں۔ کچھ لوگ دشمن کو ٹھکانے لگانے کا سوچتے رہتے ہیں

کچھ لوگ رقیب روسیاہ کو قتل کرنے اور پھر صاف بچ نکلنے کا سوچتے رہتے ہیں۔

اگر آپ کو اقتدار کی ہوس ہے تو پھر آپ لگاتار حاکم بننے کی ترکیبیں سوچتے رہتے ہیں۔

اور کبھی کبھی، اچانک ایسے واقعات رونما ہوتے ہیں جو آپ کو سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ یہ ایسی سوچ ہے جو خود بخود آپ کو آتی ہے۔ کوئی حادثہ ہو گیا۔ ریل پٹڑی سے اتر گئی۔ بوگیاں الٹ گئیں۔ لوگ مر گئے۔ زخمی ہو گئے۔ آپ خود بخود سوچ میں پڑ جاتے ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ حادثہ گارڈ کی غفلت سے ہوا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ انگریزوں کے دور کی بچھائی ہوئی پٹڑیوں پر چلنے والی ٹرین کی رفتار حد سے تجاوز کر گئی تھی؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ تخریب کاروں نے پٹڑیاں اکھیڑ دی ہوں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ ٹرین کے بریک فیل ہو گئے تھے؟ آپ ہر زاویہ سے اس حادثے کے بارے میں سوچنے لگ جاتے ہیں۔ یہ قدرتی عمل ہے۔ آپ آدمی ہیں۔ قدرت نے آپ

کے بھیجے میں سوچنے کے لیے ایک مائیکرو چپ لگادی ہے۔ آپ سوچیں گے۔ لازمی طور پر سوچیں گے۔ آپ بکرے نہیں ہیں کہ آپ کے بھیجے میں مائیکرو چپ فٹ نہیں ہے، اس لیے آپ نہیں سوچیں گے۔ سوچنا آپ کی مجبوری بن جاتی ہے۔ آپ ضرور سوچیں گے کہ ٹرین کا حادثہ کیوں اور کیسے ہوا؟ حادثہ کے اسباب کیا تھے۔

امریکہ کھلم کھلا پاکستان کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی کر رہا ہے۔ بلکہ احکامات جاری کر رہا ہے۔ الیکشن کب ہوں؟ کیسے ہوں؟ کس پارٹی کو جیتنا چاہیے؟ نتائج کے بعد پاکستان کا پریذیڈنٹ کس کو لگنا چاہیے؟ پرائم منسٹر کون بنے؟ پاکستان کی خارجہ پالیسی کیسی ہونی چاہیے؟ یہ سب وائیٹ ہاؤس واشنگٹن میں طے ہوتا ہے۔

پاکستان کے لوگ کھلم کھلا امریکہ مداخلت کے خلاف آواز کیوں نہیں اٹھاتے؟ احتجاج کیوں نہیں کرتے؟ پاکستانی حکام امریکہ سے اس قدر خوفزدہ اور ڈرے ڈرے کیوں رہتے ہیں؟

جب آپ کسی کی امداد پر پلتے ہیں۔ امداد میں ملی ہوئی روٹی کھاتے ہیں تو پھر سر اٹھا کر چلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پھر آپ خود داری کا ڈھول نہیں پیٹ سکتے۔ امریکہ کی طرف سے پاکستان کو امداد میں ہر ماہ اسی کروڑ ڈالر ملتے ہیں جس کا کوئی حساب کتاب نہیں رکھا جاتا۔ یہ رقم دہشت گردی کے روک تھام کے لیے، ہماری سرکار کو ملتی ہے۔ اس سے کہیں زیادہ امداد ہمیں ترقیاتی فنڈ کی صورت میں ملتی ہے۔ آپ ذاتی طور پر کسی سے امداد لینا پسند کریں گے؟ امداد وصول کرنے کے بعد سر اٹھا کر عزت کی زندگی گزار سکیں گے؟ میرے بھائی، جو شخص آپ کو پہننے کیلئے جانگیہ دے گا وہ آپ سے اپنی بات منوا کر رہے گا۔

بے نظیر بھٹو کی وحشیانہ ہلاکت کے بعد پاکستان میں بہت ہی عجیب وغریب سیاسی سیناریو Scenario سامنے آیا ہے۔ مجھے حیرت اس بات کی ہے کہ بہت ہی کم لوگوں نے، بلکہ انگلیوں پر گنتے جتنی تعداد نے اس چکر دینے والی سیاسی تبدیلی کو محسوس کیا ہے۔ کیا لوگوں کے بھیجے میں فٹ مائیکرو چپ نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے؟

اگلے ہفتے ہم اپنی اپنی سوچ کا پلندہ لے کر کسی جگہ مل کر بیٹھیں گے۔ اور اچانک سامنے آئے ہوئے سیاسی سیناریو کے بارے میں اظہارِ خیال کریں گے۔

پانچواں موسم

اچانک کسی کے رونے کی آواز سن کر میں دوڑتے دوڑتے رک گیا۔

اس وقت میں مارگلہ پہاڑیوں کے دامن میں گھنے جنگل سے دوڑتا ہوا جا رہا تھا۔ میں اس لیے دوڑ رہا تھا کہ موت میرا پیچھا کر رہی تھی۔ ڈاکٹروں نے کہا تھا جب تک دوڑتے رہو گے زندہ رہو گے۔ دوڑو گے نہیں تو وقت سے پہلے مر جاؤ گے۔ میں وقت سے پہلے مرنا نہیں چاہتا۔ میں مرنے سے پہلے جاگتی آنکھوں سے ایک خواب دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس ایک خواب کی خاطر میں دوڑتا رہتا ہوں۔ اسلام آباد بڑے افسروں، سفارت کاروں اور سرمایہ داروں کا شہر ہے۔ اس طرح کے لوگ عام طور پر دل کے عارضے، ذیابیطس اور موٹاپے کے امراض میں مبتلا ہوتے ہیں۔ وہ مر جانے کے خوف سے دوڑتے رہتے ہیں۔ ان کے دوڑنے کیلئے خاص طور پر راستے اور جنگل سے گزرتی ہوئی پگڈنڈیاں بنائی گئی ہیں۔ شام ہوتے ہی پتلی ٹانگوں اور موٹی توند والے گنجے ان پگڈنڈیوں پر دوڑتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ میں نہ افسر ہوں، نہ سفارت کار ہوں اور نہ سرمایہ دار ہوں۔ اس کے باوجود میں دوڑتا رہتا ہوں۔ میں سو نہیں سکتا۔ جاگتی آنکھوں سے ایک خواب دیکھنے کی تمنا میں جاگتا رہتا ہوں۔ ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ میری طرح کے لوگ وقت سے بہت پہلے مر جاتے ہیں۔ میں وقت سے پہلے مرنا نہیں چاہتا۔ وقت سے پہلے مر جانے والے لوگ ابدی طور پر نہیں مرتے۔ وہ ایک خواب کی خاطر پھر سے جنم لیتے ہیں۔ میں پھر سے جنم نہیں لینا چاہتا۔ میں اسی جنم میں ایک خواب دیکھنا چاہتا ہوں۔ ایک خواب کی خاطر میں افسروں کے شہر اسلام آباد میں دوڑتا رہتا ہوں۔

یہ پچھلے ہفتے کی بات ہے۔ مارگلہ کے دامن میں گھنے جنگل سے گزرتی ہوئی پگڈنڈیوں پر دوڑتے ہوئے میں نے کسی کے رونے کی آواز سنی۔ میں اچانک رُک گیا اور رونے کی آواز سننے لگا۔ کوئی زار و قطار رو رہا تھا اور سسکیاں لے رہا تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا لیکن رونے والا شخص

مجھے نظر نہیں آیا۔ میں نے دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ رونے کی آواز کسی مرد کی تھی۔ کسی عورت کی آواز نہیں تھی۔ ورنہ میں اسے چڑیل سمجھ کر سر پر پیر اور پیروں پر سر رکھ کر بھاگ جاتا۔ مجھے چڑیلوں سے بہت ڈر لگتا ہے۔ اسلام آباد میں آدم خور کے علاوہ چڑیلوں کی بھی خاصی تعداد آباد ہے۔ جب کبھی میں کسی چڑیل کو بیوٹی پارلر میں داخل ہوتے یا کسی بیوٹی پارلر سے نکلتے ہوئے دیکھتا ہوں تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور مجھے گرمیوں میں ٹھنڈے پسینے اور سردیوں میں گرم پسینے آنے لگتے ہیں۔

میں نے آواز دی ''اے رونے والے اجنبی تم کہاں ہو اور مجھے نظر کیوں نہیں آ رہے ہو۔''

آواز آئی۔ ''افسوس کہ تم مجھے نہیں دیکھ سکتے۔''

''کیوں نہیں دیکھ سکتا؟'' میں نے پوچھا۔ ''کیا تم جن وغیرہ قسم کی کوئی چیز ہو؟''

''نہیں''۔ اس کی آواز آئی۔ کہا ''جس درخت کے تنے کے قریب تم کھڑے ہو اس تنے کی دوسری جانب میں بیٹھا ہوں۔ افسوس کہ تم تنے کے آر پار نہیں دیکھ سکتے۔''

مجھے اپنی حماقت پر افسوس ہوا۔ میں نے کہا ''اے رونے والے اجنبی میں تنے کی دوسری جانب تم سے ملنے اور تمہارا درد معلوم کرنے کے لئے آ رہا ہوں۔''

میں تنے کی دوسری طرف جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ رونے کی آواز بدستور آ رہی تھی۔ میں نے قدرے غصے سے کہا یہ کیا مذاق ہے۔ تم تو یہاں پر موجود نہیں ہو۔''

آواز آئی۔ ''اب میں تنے کی دوسری جانب چلا گیا ہوں۔ میں تمہارے سامنے آنا نہیں چاہتا۔ میں نہیں چاہتا کہ تم مجھے دیکھو۔''

''کیوں نہیں دیکھوں''۔ میں نے پوچھا۔ ''کیا تم ننگے ہو؟''

''نہیں''۔ اس نے روتے ہوئے کہا۔ ''مجھے دیکھ کر تم ڈر جاؤ گے''۔

''کیوں ڈر جاؤں گے؟'' میں نے پوچھا۔ ''کیا مجھے دیکھ کر غرانے لگو گے۔''

کہا۔ ''شاید''

میں نے پوچھا۔ ''کیا تم جانور وغیرہ قسم کی کوئی چیز ہو؟''

اس نے روتے ہوئے کہا۔ ''ہاں، میں خوں خوار جانور ہوں۔''

''اگر تم خوں خوار قسم کے جانور ہو تو یقین کرو میں تمہیں دیکھ کر نہیں ڈروں گا۔'' میں نے کہا۔ ''ٹیلی وژن پر طرح طرح کے جانور دیکھنے کے بعد اب ہم نے جانوروں سے ڈرنا چھوڑ دیا ہے۔ تمہیں دیکھنے کے لئے میں تنے کی دوسری جانب آ رہا ہوں۔ خدا کے لئے مجھے چکر مت دینا۔''

میں تنے کی دوسری طرف چلا گیا۔ میں نے دیکھا ایک شیر تنے سے لگ کر بیٹھا ہوا تھا۔ اور زار و قطار رو رہا تھا۔ میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ کسی شیر کو روتے ہوئے دیکھا تھا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ سچ پوچھئے تو ایک عرصے سے میں نے اپنی آنکھوں پر یقین کرنا چھوڑ دیا ہے۔ ایک مرتبہ میں نے اسلام آباد میں ایک بے انتہا خوبصورت لڑکی کو دیکھا تھا۔ دیکھتے ہی میں اس پر عاشق ہو گیا تھا۔ وہ اکثر اپنی چھ بہنوں کے ساتھ گھومتی پھرتی اور سیر سپاٹے کرتے ہوئے نظر آتی تھی۔ وہ چھ بہنوں میں سب سے چھوٹی لگتی تھی۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ چھ بہنوں میں سب سے چھوٹی نہیں تھی۔ وہ ان کی بہن نہیں تھی۔ وہ ان لڑکیوں کی ماں بھی نہیں تھیں۔ وہ اصل میں ان لڑکیوں کی نانی تھی۔ جب پانچواں موسم ماحول پر چھا جاتا ہے تب آنکھیں جو کچھ دیکھتی ہیں وہ وہ نہیں ہوتا۔ اور جو کچھ ہوتا ہے وہ ہمیں نظر نہیں آتا۔

مجھے شیر کے ہونے پر شک گزرنے لگا۔ میں نے سوچا یہ ضرور کسی بکرے کا باپ ہے اور شیر کی کھال پہن کر اپنے بیٹے کی خیر منانے کی کوشش کر رہا ہے اور فطرت کے مطابق زار و قطار رو رہا ہے۔

مجھے سوچ میں گم سم دیکھ کر شیر نے کہا۔ ''میں نے کہا تھا نا کہ مجھے دیکھ کر تم ڈر جاؤ گے''۔

''تم غلط سمجھے ہو۔'' میں نے کہا۔ ''میں تمہارے بارے میں سوچ رہا تھا۔''

شیر نے پوچھا۔ ''تم میرے بارے میں کیا سوچ رہے تھے؟''

میں نے کہا۔ ''میں سوچ رہا تھا کہ بظاہر تو تم شیر دکھائی دے رہے ہو لیکن اصل میں کیا چیز ہو۔''

شیر نے چونک کر پوچھا۔ ''کیا مطلب؟''

میں نے کہا'' مطلب یہ کہ شیر کی کھال میں تم بکرے ہو، کسی بکرے کے باپ ہو یا پھر گیدڑ ہو۔''

''بکواس کرتے ہو۔'' شیر نے غصے میں کہا'' میں اصلی اور خالص شیر ہوں۔تم چاہوتو میری کھال نوچ کر دیکھ سکتے ہو''۔

''معاف کرنا یار'' میں نے کہا۔''اصلی اور خالص شیر پنجروں میں بند ہوتے ہیں۔ہمارے ہاں شیر آزاد نہیں گھوم سکتے۔''

''میں جانتا ہوں۔خوب جانتا ہوں''۔شیر دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

''میں پنجرے میں بند ہو جانے سے نہیں گھبراتا۔'' شیر نے اپنے پنجے سے اپنی ناک صاف کرتے ہوئے کہا۔بس میں سرکس والوں سے ڈرتا ہوں۔میں ان کے ہتھے لگنا نہیں چاہتا۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

شیر نے غرّائی ہوئی آواز میں کہا۔'میں رِنگ ماسٹر کے اشاروں پر کرتب نہیں دکھا سکتا۔اسٹول پر بیٹھ کر تماشائیوں کو سلام نہیں کر سکتا۔میں خودکشی کر لوں گا۔''

اس سے پہلے کہ میں اسے تسلی دیتا شیر نے کہا''۔تم اگر چاہو تو میری مدد کر سکتے ہو۔''

''کیسی مدد؟'' میں نے پوچھا۔

شیر نے کہا۔''مجھے کسی بکرے یا گیدڑ کی کھال لا کر دو۔''

''وہ کس لئے!'' میں نے تعجب سے پوچھا۔

شیر نے کہا۔تمہارے معاشرے میں گیدڑ اور بکروں کی قدر ہوتی ہے۔شیروں کی نہیں۔مجھے خدا کے لئے گیدڑ یا بکرا بنا دو۔میں قوم و ملک کی بے لوث خدمت کرنے کے جذبے سے سرشار ہو چکا ہوں۔''

شیر کے ملّی جذبے سے میں بہت متاثر ہوا۔میں نے کہا۔تم نے مجھے متاثر کیا ہے۔تم دنیا کے واحد شیر ہو جس نے گیدڑ یا بکرا بن کر قوم کی خدمت کرنے کا تہیہ کر رکھا ہے۔مبارک ہیں تمہارے جذبات۔میں تمہیں سلام کرتا ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ کل شام اسی جگہ میں تمہیں گیدڑ یا کسی بکرے کی کھال لا کر دوں گا تا کہ تم قوم کی خدمت کر سکو۔''

شیر نے مجھے اٹھ کر گلے لگا لیا۔اور کہا۔''میں تمہارا انتظار کروں گا پردیسی بابو۔''

میں نے کہا ''یہ ڈائیلاگ تمہارے منہ سے اچھا نہیں لگتا۔ یہ ڈائیلاگ کسی فلم کی پہاڑی حسینہ کے منہہ سے اچھا لگتا ہے۔''

اور اس کے بعد ہم دونوں نے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا۔ میں پھر گھنے جنگل کے درمیان پگڈنڈیوں پر دوڑنے لگا۔ میں نے سوچا کئی قصائی میرے منجھلے ماموں کے دوست ہیں۔ ان کے توسط سے بکرے کی کھال لے کر شیر تک پہنچا دوں گا۔ اس نیک کام میں مجھے دیر نہیں کرنی چاہیے۔ پانچویں موسم میں شیر زیادہ دیر تک آزاد نہیں رہتے۔

اپنے گھر کی بجائے میں دوڑتا ہوا سیدھا منجھلے ماموں کے یہاں جا پہنچا۔ میرے ماموں تین ٹانگ والی کرسی پر بیٹھ کر ٹیلی وژن سے شام کی خبریں دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے ٹیلی وژن سیٹ کی آواز بند کر دی تھی۔

مجھے دیکھتے ہی ماموں نے پوچھا۔ ''آج کون سی نئی تازہ خبر لائے ہو۔''

''آج میں نے ایک شیر کو روتے اور بولتے ہوئے دیکھا ہے۔'' اور اس کے بعد میں نے شیر سے اپنی گفتگو کا قصہ ماموں جان کو سنا دیا۔

''یہ سب بکواس ہے۔ تمہارے ذہن کی اختراع ہے۔'' ماموں جان نے غصے سے کہا ''جاگتے میں ایک خواب دیکھنے کی انہونی تمنا نے تمہیں پاگل بنا دیا ہے۔''

''میں پاگل نہیں ہوں ماموں جان۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔ جب پانچواں موسم آتا ہے تب لوگ اسی طرح محسوس کرنے لگتے ہیں۔''

''ابے کون سا پانچواں موسم؟'' ماموں نے غصے سے تلملائے ہوئے کہا۔ تو پاگل ہو گیا ہے۔ تو اب مکمل طور پر پاگل ہو گیا ہے۔ میں تجھے گدّو بندر بھجوا دوں گا۔''

میں نے کہا ''آپ جہاں چاہیں مجھے بھجوا دیں۔ لیکن کہیں بھجوانے سے پہلے مجھے بکرے کی کھال دلوا دیں۔ ایک مظلوم شیر میرا انتظار کر رہا ہے۔''

ماموں نے کہا۔ ''میں کہاں سے دلواؤں تجھے بکرے کی کھال''۔

میں نے ماموں کو ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ بہت سے قصائی آپ کے دوست ہیں۔ روزانہ شام کو محفل جمانے کے لئے آپ کے ہاں آجاتے ہیں''۔

ماموں نے غصے سے اچھلتے ہوئے کہا۔''ابے وہ سب ڈاکٹر ہیں۔قصائی نہیں ہیں۔

''وہ سب کے سب قصائی ہیں۔''میں نے کہا۔''نہ جانے کیوں ہر قصائی آپ کو ڈاکٹر نظر آنے لگتا ہے۔''

''کچھ بعید نہیں کہ میں تجھے جان سے مار ڈالوں''۔ماموں جان نے کہا''میرے تمام دوست ڈاکٹروں نے کہا تھا کہ تیرا بھانجا پاگل ہو گیا ہے۔اسے پاگل خانے بھجوادے۔''

''آپ کے قصائی دوست جس جگہ کو پاگل خانہ کہتے ہیں وہ اصل میں پاگل خانہ نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔''اس جگہ وہ لوگ گائے،بھینس اور بکرے ذبح کرتے ہیں۔آپ اگر چاہیں تو آسانی سے ایک بکرے کی کھال مجھے دلوا سکتے ہیں۔''

ماموں جان نے فون کیطرف جاتے ہوئے کہا۔''میں ابھی بندوبست کرتا ہوں تیرے لئے بکرے کی کھال کا''۔

ماموں نے دو چار مرتبہ ٹیلی فون کے نمبر گھمائے۔تھوڑی دیر میں ماموں کے قصائی دوست جن کو وہ ڈاکٹر سمجھتے تھے پہنچ گئے۔انہیں دیکھ کر میں بہت خوش ہوا اور بہت دیر تک تالیاں بجاتا رہا۔وہ لوگ بہت شفقت اور پیار سے مجھے ایک عجیب سے کمرے میں لے گئے جہاں بے انتہا روشنی ہونے کے باوجود اندھیرا تھا۔انہوں نے میرے کپڑے اتار کر مجھے ننگا کر دیا۔اور اس کے بعد انہوں نے جسم سے میری کھال کھینچ کر اتار دی۔

اس سے پہلے کہ تکلیف کے باعث میں صورِ اسرافیل سے اندھیروں کو اجالے میں بدل دیتا انہوں نے میرے جسم پر بکرے کی کھال چڑھا دی۔

میں اکثر بھول جاتا ہوں کہ بکرے خواب نہیں دیکھتے۔جاگتے میں ایک خواب دیکھنے کی تمنا لئے میں گھنے جنگلوں کے درمیان دوڑتا رہتا ہوں۔ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ موت میرا تعاقب کر رہی ہے،مجھے دوڑنا چاہیے میں دوڑتا رہتا ہوں اور جنگل میں تنہا رونے والے اس شیر کو یاد کرتا ہوں جس نے بکرے کی کھال پہن کر زندہ رہنے کی تمنا کی تھی۔

امرجليل (سندھی کھانی)

مان برف ۾ توسان ملندس

تڏهن، مريءَ ۾ موسم جي پهرين برف پيئي هئي. هر طرف ڪپهه جهڙي ڪونئري، ۽ ڪفن جهڙي اڇي ۽ بيداغ برف جا تهه ڄمي ويا. سڀ ڪجهه برف جي تهن هيٺان دفن ٿي ويو. هر رنگ بيرنگ ٿي ويو.

اوچتو، برف جي ڦٽين سان گڏ موت جهڙي سرد هوا هلڻ لڳي. سيءَ جي شدت وڌي ويئي، ماڻهو مال روڊ تان کسڪڻ لڳا. هوٽلون ۽ ريسٽورنٽ پرجڻ لڳا. جتي، ڪجهه دير اڳ رونق هئي، رنگارنگي لباسن ۾ ماڻهن جي انبوهه جي چهل پهل هئي، اتي ڪن پل ڪان پوءِ ڪجهه باقي نه بچيو، سڀ ڪجهه خواب جي تعبير، وانگر بدلجي ويو. مال روڊ ڏسنديئي ڏسندي گوڏي حيڏي برف سان ڍڪجي ويو. تڏهن اوچتو، مون هڪ هيڪلي ڪي هولي ٽرنٽي چرچ جي ٻاهرين پٽ پرسان بيٺل ڏٺو. هو اڌڙ عمر وارو طاقتور شخص هو. ڪاري اووَر ڪوٽ سان برف جي رڻ ۾ مون کي بيحد پُراسرار محسوس ٿيڻ لڳو. هو ڪليسا جي صليب هيٺان بيٺو هو. سندس مٿو اگهاڙو هو. وارن تان برف جا تهه لاهي، "هن ڪنڌ کڻي صليب ڏانهن ڏٺو، هو مونکي بيرابس لڳو، جنهن کي پنهنجي زندگيءَ بدران يسوع مسيح جيئدان رڻي ڏنو هو.

ڪجهه دير اڳ، جڏهن منهنجي پٽ نعيم مون کي پنهنجين لوهه جهڙين ٻانهن سان ياڪر ۾ پريندي چيو هو، لڳيم ٿو، بابا، مريءَ سان اوهان جي

ڪا غير معمولي ياد ٻڌل آهي، تڏهن هو ڪليسا جي ٻاهرين پٽ پرسان بيٺل نہ هو. تڏهن هو اُتي موجود نہ هو.

”اڙي وڏو ڪو بدمعاش آهين!“ مون نعيم ڪي پيٽ ۾ ٺونشو وهائي ڪڍيو هو. ٺهڪ ڏيئي نعيم مون کان ڏار ٿي ويو هو. ويهن سالن جو آهي. اينڊرڙ نرمبر ۾ ايڪويهن سالن جو ٿيندو. قائداعظم يونيورسٽيءَ مان انٽرنيشنل رليشنس ۾ ايم، اي ڪري رهيو آهي. مڊل ويٽ ۾ يونيورسٽيءَ جي باڪسنگ ٽيم جي نمائندگي ڪندو آهي. ڏاڍو طاقتور آهي. قد ۾ مون کان چار انچ وڏو آهي. ماڻهو چوندا آهن تہ ڪنهن بہ پيءُ پنهنجي پٽ سان ايڏي ۽ اهڙي محبت ورلي ڪئي هوندي جهڙي محبت مون نعيم سان ڪئي آهي، ۽ ڪنهن بہ پٽ اهڙي محبت پنهنجي پيءُ سان نہ ڪئي هوندي جهڙي محبت نعيم مون سان ڪئي آهي. مان ڪنهن ڪنهن مهل نعيم لاءِ ڏاڍو اُداس ٿي پوندو آهيان. مان اڪثر ان اينڊرڙ گهڙيءَ کان ڪنبي ويندو آهيان، جڏهن اسان ٻنهي جي زندگيءَ جي ڊرامي تان پڙدو کڄندو! تڏهن هو منهنجي باري ۾ ڇا سوچيندو! تڏهن هو پنهنجي باري ۾ ڇا سوچيندو!

برف پوڻ کان اڳ نعيم مون کي چيو هو، ”پيراڊائيزسئنيما ۾ اينٿوني ڪوئن ۽ محمد علي ڪلي جي فلم ”ريڪوئيم فار دي هيوي ويٽ“ هلي رهي آهي. اوهان جو ڪهڙي موڊ آهي؟“

”منهنجو موڊ!“ مون هيڏانهن هوڏانهن ڏسندي چيو هو، ”مان مال روڊ تي گهمندس. بڪ گيلريءَ مان ڪجهہ ڪتاب وٺندس. ۽ هونءَ بہ اِها فلم مون ڪراچيءَ جي ريڪس سئنيما ۾ تنهنجي پيدا ٿيڻ کان اڳ ڏٺي هئي!“

”ايڏي پراڻي آهي!“ نعيم تعجب وچان پڇيو هو.

”اڙي تون کو موهن جي دڙي جو ماڻهو آهين ڇا!“ سندس هٿ جهليندي چيو هوم، ”چوويهن- پنجويهن سالن جي ڳالهه آهي. تڏهن مان اچا ڪراچي يونيورسٽيءَ ۾ پڙهندو هوس.“

ڪلي پڇيائين، ”نو ڪمپني؟“

ڪيس ٻنهي ڏورن کان جهليندي چيم، ”نو ڪمپني، ماء سئيٽ لِٽل سن.“

واچ ۾ وقت ڏسندي چيو هٽائين، ”سادي ڇهين لڳي بُڪ گيلريءَ ۾ ملنداسين.“

هاڪار ۾ مون فقط ڪنڌ لوڏيو هو.

نعيم پاڻهه مان پڇيو هو. ”ڪنهن سان ملڻ جو مخفي پروگرام ته نه ناهيو اٿوَا“

مون ڪيس ڏوري تي ٺونشو هنيو هو.هو ڪلندو پيراڊائيز سئنيما ڏانهن هليو ويو هو. تڏهن اچا برفباري شروع نه ٿي هئي.

ٿوري دير کان پوء جڏهن آسمان مان ڪپهه جهڙي ڪونئري برف ڪرڻ لڳي، ۽ زندگيءَ جا مصنوئي ۽ عارضي رنگ ڪوري ڪفن جهڙي وجود ۾ گم ٿيڻ لڳا، تڏهن مون پهريون دفعو ڪيس هولي ٽرنٽي چرچ جي ٻاهرين پٽ پرسان مال روڊ تي بيٺل ڏٺو. هن جون نگاهون ڪليسا جي صليب تي ڪتل هيرن. برف ڏسندي ڏسندي صليب برف سان اچو ٿي ويو. ان ئي گهڙيءَ هن جي عينڪ جا شيشا برف سان ڍڪجي ويا. هو صليب تي لٽڪيل برف ڏسي نه سگهيو. سندس نگاهن ۾ سڀ ڪجهه ڌنڌ جي پردن پٺيان گم ٿي ويو. هن ڪنڌ هيٺ ڪيو. عينڪ جي شيشن تان برف جو تهه ترڪي ويو. هو ڪليسا جي پٽ ڪي ٽيڪ ڏيئي بيهي رهيو. هينئر هو مون کي اجنبي ۽ اوپرو

محسوس نہ ٿيو. مون ڪيس سچائي ورتو.

ڪليسا جي ٻاهرين پٽ پرسان مال روڊ تي گوڏي جيڏي برف ۾ اڪيلو بيٺل شخص مان هوس.

مان ڪليسا جي ٻاهرين پٽ پرسان بيٺو هوس. ڪجهہ ماڻهو سئمس ۽ لنڻانس ريسٽورنٽس جي درين مان تعجب وچان مون ڏانهن ڏسڻ لڳا. نوجوانن جو هڪ ٽولو، هڪ ٻئي پاسي ڪان اچي لنگهيو. مون ڪي پٽ پرسان، برف ۾ اڪيلو بيٺل ڏسي، ٽولي ۾ شامل ڪجهہ نوجوان بيهي رهيا. هنن سڙٻانن ۾ ڪو فيصلو ڪيو. پوءِ هڪڙي نوجوان فٽ بال جيڏو برف جو گولو ٺاهي مون ڏانهن اُڇلايو، ۽ ٻين وڏي واڪ چيو، ”اڙي چريو آهين ڇا؟“

مون ڪين جواب نہ ڏنو، هو کلندا، خوش ٿيندا، تاڙين جي لئي تي نچندا اڳتي وڌي ويا. هنن جو جملو مون ڪي وٽيو. سندن جملي ۾ منهنجي ماضيءَ جو واضح پڙاڏو هو. اهو منهنجو پنهنجو ئي جملو هو، جيڪو ورهين ڪان پوءِ مون ڪي ٻڌڻ ۾ آيو هو. ڪاليج ۽ يونيورسٽيءَ جي موڪلن ۾ اسين جڏهن بہ مري ايندا هئاسين، تڏهن اهڙي ئي نموني ماڻهن تان کلندا هئاسين، ڪين تنگ ڪندا هئاسين، مٿن ٺٺوليون ڪندا هئاسين.اسين سندن ظاهر تہ ڏسي سگهندا هئاسين، پر سندن باطن ڏسي نہ سگهندا هئاسين، سندن رنگين لباسن، برساتين ٽوپين، اووَر ڪوٽن ۽ مفلرن جي بهار تہ ڏسي سگهندا هئاسين، پر سندن وجود جي ويرانين جي خزان ڏسي سگهندا هئاسين. چهرن جي رونق تہ ڏسي سگهندا هئاسين، پر دل جي وحشت ڏسي نہ سگهندا هئاسين.

دل چاهيو تہ نوجوانن کي سڏ ڪري بيهاري ڇڏيان، ڪين ترسايان، سندن ڏيان ٽرنٽي چرچ جي صليب ڏانهن ڇڪايان. ڪين ٻڌايان تہ زندگيءَ ۾ ڪا پهر اهڙي بہ ايندي آهي جڏهن اسين ڪنهن صليب هيٺان بيهي رهندا آهيون. ويل وقت کي سڏيندا آهيون. ماضيءَ جي گهڙيءَ گهڙيءَ کي پڪاريندا آهيون. پر ماضي واپس نہ ورندو آهي، لمحن جو سج لهي وري نہ چڙهندو آهي. گذريل گهڙيون خيرات وانگر ڪشڪول ۾ نہ ڪرنديون آهن. هڪ ياد جي ليڪ رت جي اندلٺ وانگر اندر جي آسمان تي موجود رهندي آهي، تہ تقدير جي شب خون جي شاهدي ڏيندي آهي. مقدر جي ڪاتب جو قلم جڏهن اسين هٿ ۾ ڪٺندا آهيون، تڏهن پروڙ پوندي آهي تہ اسان جون آڱريون وڍيل آهن، ۽ اسين لوح محفوظ جي تحرير مٽائي نہ سگهندا آهيون.

مون نوجوانن ڏانهن ڏٺو. هو بڪ گيلري (ڪتابن جو دڪان) وٽان لنگهي رهيا هئا. هنن اُتان ڪنڌ ورائي مون ڏانهن ڏٺو، ۽ هٿ لوڏي ڇڏيو. جواب ۾ مون پنهنجو هٿ مٿي ڪيو. هو ڏاڪڻ لهي هيٺين بازار ڏانهن هليا ويا.

سئمس ۽ لنٽانس ريسٽورنٽس مان مون ڏانهن ڏسڻ وارن جو تجسس ختم ٿي ويو. هنن مون کي نظر انداز ڪري ڇڏيو. هو گرم گرم چانهہ ۽ ڪافيءَ جي ڪوپن مان سرڪيون ڀرڻ لڳا. هو ٽيبلن تي ٻانهون رکي، اڳتي جهڪي اندر اورڻ لڳا.

يخ جهڙي هوا تير وانگر مون کي جسم ۾ چڀڻ لڳي. سوچيم، سئمس ۾ وڃي ويهندس، دريءَ مان برف کي آسمان مان لهندي ڏسندس، ۽ گرم گرم ڪافيءَ جي سپ سپ سان ٺڏي ٺينڊڙ جسم کي ڪنبڻ کان بچائي وٺندس. تڏهن، مون اوچتو محسوس ڪيو تہ بڪ گيلريءَ جي ٻاهرين در وٽان ڪو

مون ڏانهن ڏسي رهيو هو.

هو ڏند ۾ ڪوهيڙي جي ڪڪر پٺيان مون ڏانهن وڌڻ لڳو. قداور، طاقتور، ماحول ڪان بي نياز! هو مضبوط قدمن سان مون ڏانهن وڌڻ لڳو. مال روڊ تي وچايل گوڏي جيڏي برف جهاڳڻ لڳو. جيڪيٽ جي زپ، ۽ قميص جا بٽڻ کليل هئس. وار وکريل هئس. ڪير آهي! مون سوچيو. هو مون کي نظر چو نه ٿو اچي! ڪرندڙ برف جي پٽ ايڏي نهري به نه آهي جو مان ڪيس چڱي طرح ڏسي نه سگهان! ائين ته ناهي، اينڪل سيريا نرسنگ هوم جي ڪمري نمبر 34 مان پنجويهه سال اڳ گم ٿي ويل هڪ سختگير نوجوان عالم وجود ۾ اچي رهيو هو۽ منهنجي وجود ۾ داخل ٿيڻ لاء مون ڏانهن وڌي رهيو هو!الاء! پر اهو ممڪن به ته نه آهي ! منهنجي وجود کي هن جي هينئر قطعي ضرورت نه آهي ـ نعيم جي موجودگيءَ ۾ مون کي هن جي ضرورت نه آهي. نه، نه. هو ڪنهن به صورت ۾ نعيم ڪان مضبوط، طاقتور، سرڪش ۽ بي نياز نه هو. هو پنجويهن سالن ڪان پوء چو مون ڏانهن وڌي رهيو آهي! پر، اهو ڪنهن به صورت ۾ ممڪن نه آهي. هن جي واپسي امڪان ڪان ٻاهر آهي ته پوء هيءُ ڪير آهي جيڪو موسم جي سختي ۽ ماڻهن جي تجسس ڪان بي نياز مون ڏانهن وڌي رهيو آهي! ڪير آهي!

”بابا!“ لوهه جهڙين ٻانهن ۾ ڍال جهڙي سيني سان ياڪر ۾ پرجي مون ڪان چرڪ نڪري ويو. هو نعيم هو.

”بابا!“ نعيم مون کي پيار ڪندي چيو. ”ڪيئن آهيو بابا!“

”چو!“ تعجب وچان ڪانئس پڇيم، ”چا ٿيو آهي مون کي! پر، تون ته فلم ڏسڻ ويو هئين!“

نعيم مون کي سخت پريشان نظر آيو. پڇيائين، ”هيڏي برف ۽ ولهه ۾ بيٺا آهيو.“

شعور جي واڳ ورائڻ کان اڳ منهنجي وات مان نڪري ويو، ”يار، ايڏي برف تہ نہ پئي آهي.“

”ٻہ فٽ پئجي چڪي آهي!“ نعيم مون کي ٻانهن کان جهليندي پاٻوهہ مان پڇيو ”اوهين ٺيڪ تہ آهيو نہ، بابا.“

”يار مان ٺيڪ آهيان.“ مون پاڻ کي سنڀالي ورتو. چيم، ”تون ڇا ٿو سمجهين! برف ۽ هوا ۾ فقط تون ئي سينو کولي سگهين ٿو! وِيٽي ڇڏائي ڏيکار.“

مون ٻئي هٿ سندس رُڪ جهڙي وِيٽيءَ ۾ وجهي ڇڏيا. هو ٺهڪ ڏيئي کلي پيو. چيائين، ”نات پاسيبل بابا۔نات پاسيبل بابا.“

هو ڏاڍو طاقتور آهي. بنا ڪنهن زور آزمائيءَ جي ٻانهن ڇڏائي وٺندو آهي. پر، جڏهن پيار سان ٽمٽار هوندو آهي، تڏهن چوندو آهي، ”نات پاسيبل بابا...... نات پاسيبل بابا.“جمعي جي ڏينهن اسين ٻئي منجهند جي ماني کٽي مارگلہ ٽڪرين جي چوٽيءَ تي چڙهي ويندا آهيون. قوت سان ڀريل ۽ ڀرپور هوندو آهي. پر، مون کي سهڪندي ڏسي پاڻ بہ ويهي رهندو آهي. پڇندو آهيانس تہ اڳتي هلئون! تڏهن چوندو آهي، ”نات پاسيبل بابا...... نات پاسيبل بابا.“

پڇيائين، ”برف ۾ ڇو بيهي رهيا آهيون.“

وراڻيم، ”لطف اندوز ٿيڻ لاءِ.“

شرارت واري مرڪ چپن تي تري آيس. پڇيائين، ”برف پوندي ڪنهن

سان ملڻ جو انجام تہ نہ ڪيو اٿوَا''

مون ڪيس ہہ ٽي ٽونشا پيٽ ۽ سيني تي وهائي ڪڍيا. هن مونکي پاڪر ۾ ڀري ورتو. سندس ٻانهن ۾ ٿي هوس جو ڪلندي چيائين، ''اوهانجي دوستن ڪان ٻڌو اٿم تہ ڪاليج ۽ يونيورسٽيءَ ۾ اوهين ڏاڍو رومانٽڪ هوندا هئا.''

''اڙي پوڪ تون ڇا ٿو سمجهين!'' ڪلندي چيم، ''مان هينئر بہ رومانٽڪ آهيان.''

منهنجي منهن ۾ ڏسندي پڇيائين، ''سچ!''

چيم. '' آزمائي ڏس''

پوءِ اوچتو، ڇڻ ڪيس ڪجهہ ياد آيو. چرڪ ڀري چيائين، ''اوهان ڪي برف ۾ بيئل ڏسي، مون ڪان سڀ ڪجهہ وسري ويو.'' ''يار نعيم.'' چيم، ''تون تہ پٽ بدران جيڪر منهنجي ماءُ هجين ها.''

هڪدم گنڀير ٿي ويو. پڇيائين، ''اوهين منهنجي ماءُ نہ آهيوا''

سندس منهن ٻنهي هٿن ۾ جهلي ڪيس نرڙ تي مٺي ڏنم. پڇيومانس، ''ٽڪيٽ نہ مليءِ ڇا، جو موٽي آيو آهين.''

ڪيسي مان ٽڪيٽ ڪڍي ڏيکاريندي چيائين، ''فلم انٽرويل ڪان پوءِ شروع ٿيندي. دل ڪيو تہ اوهان سان ڪافي پي پوءِ فلم ڏسان.''

''او-ڪي.'' چيم، ''مون کي بہ ڪافيءَ جي سخت ضرورت آهي.''

سٽمس رسٽورنٽ جي ڏاڪي تي پير رکي هو بيهي رهيو. منهن ورائي مون ڏانهن ڏٺائين. چيائين، ''بابا، ڪينٽ شاپنگ سينٽر وٽ مون هڪ عورت ڏٺي؛ هوبهو امان جهڙي هئي......بس، امان ڪان پوڙهي هئي......مٿي

جا وار بہ ذري گهٽ اچا هئس.“

سندس ڪلهي تي هٿ رکندي چيم، ”تنهنجي ماءُ بہ هن وقت تائين پوڙهي ٿي چڪي هجي ها.“

چيائين، ”اوهان جي ۽ منهنجي بيڊ روم ۾ امان جي جيڪا تصوير لڳل آهي نہ، هوبهو ان تصوير جهڙي هئي.“

مون دل ۾ بيچيني محسوس ڪئي.“

نعيم چيو، ”منهنجو خيال آهي، اوهين بہ هلي ڪيس ڏسو.حيرت انگيز حد تائين امان جهڙي آهي......بس ڪجهہ ڪجهہ پوڙهي آهي.“

چيم، ”هن انبوهہ ۾ ڪيس ڪٿي ڳولينداسين.“

”اوهين هلو تہ سهي.“ نعيم چيو ”ڪيس ڏسي اوهين بہ حيران ٿي ويندا.“

هو مونکي وٺي ڪينٽ شاپنگ سينٽر آيو. ڊڪيل هئڻ سبب ڪينٽ شاپنگ سينٽر ۾ چڱي پيهہ هئي. نعيم ڪنڌ ورائي وچولي عمر جي عورتن ڏانهن ڏسڻ لڳو. ڪيس چيم، ”اهڙي طرح عورتن ڪي ڏسڻ شروع ڪيوسين تہ پڪ ڄاڻ حدود آرڊيننس جي ڀڃڪڙيءَ ۾ پڪڙيا ويندا سين.“

نعيم گنڀير هو. هن جواب نہ ڏنو. هن ڪي جنهن جي تلاش هئي، سا ڪيس نظر نہ آئي. هو اتاولو ٿيڻ لڳو. چيائين، ”مون ڪيس هتي، هن جاء تي ڏٺو هو بابا.“

”ڏٺو هوندء.“ چيم، ”پر ايتري دير تائين هوءَ هتي ڇو بيهي رهندي.“

”ها.“ هن پنهنجي ساء چيو ”هوءَ ايتري دير تائين هتي ڇو بيهي رهندي!“

”منهنجو خيال آهي، تون وجي اينٽي ڪوئن ۾ محمد علي ڪلي جي فلم ڏس.“ مون ڪيس سمجهائيندي چيو. ”ماڻهن جون شڪليون هڪٻئي سان مشابهت رکنديون آهن. ان ۾ حيران يا پريشان ٿيڻ جهڙي ڪا به ڳالهه ڪونهي.“

پر، هو پريشان هو. پوء هن، هيڏانهن هوڏانهن ڏسندي منهنجو روح فنا ڪري ڇڏيو. چيائين، ”مان جڏهن ويجهو ويومانس، تڏهن هن غور سان مونڏانهن ڏٺو. مان سمجهان ٿو، هن به مونکي سڃاتو هو.“

مان پنهنجي سموري وجود سان ڪنبي ويس. چيم، ”اهو ممڪن نه آهي.“

”ڇو ممڪن نه آهي.“ نعيم چيو، ”ڇا مائرون پنهنجي پٽن کي سڃاڻي نه سگهنديون آهن!“

سندس هٿ پنهنجي هٿ ۾ جهليندي چيم، ”توکي جنم ڏيڻ کان هڪدم پوء هوءَ گذاري ويئي هئي.“

نعيم جي چهري تي اُداس شام جا پاڇا لڙي آيا. هو وياڪل ۾ ويڳاڻو ٿي پيو.

پنهنجي ساء، ڏک وچان چيم، ”هوءَ تو کي سڃاڻي نه سگهي ها، پٽ.“

نعيم چيو، ”هوءَ هوبهو امان جهڙي هئي- ان تصوير جهڙي هئي، جيڪا اوهانجي ۾ منهنجي بيڊروم ۾ رکيل آهي.“

سندس خيال مٽائڻ خاطر چيم، ”انٽرويل ختم ٿي ويو هوندو. هل، مان تو کي پيراڊائيز وٽ ڇڏي ٿو اچان.“

ڪينٽ شاپنگ سينٽر جون ڏاڪڻيون لهي، اسين پيراڊائيز سئنيما ڏانهن

وڏي وياسين. مون ڏٺو تہ نعيم تمام گهري سوچ ۾ ٻڏل هو. هو آسمان مان ڪرندڙ برف کان بي نياز هلي رهيو هو. سندس اکين ۾ اُتٿل هئي. ذهين انسانَ ڪائنات ۾ پنهنجي وجود جي دليل بابت ضرور سوچيندا آهن. هو جڏهن ڪنهن بہ نتيجي تي پهچي نہ سگهندا آهن، تڏهن اُداس ٿي پوندا آهن.

پيراڊائيز سئنيما وٽ مون نعيم کي چيو، ”اڙي چريا، مان اول تنهنجي ماءُ آهيان، ۽ پوءِ پيءُ. هاڻي ويٺي چڏائي ڏيکار.“

مون ٻئي هٿ سندس ويٽيءَ ۾ وجهي ڇڏيا. هن مون ڏانهن ڏٺو. سندس چپن تي مرڪ تري آئي. ممتا لاءِ واجهائيندڙ پار وانگر هو مون ڏانهن ڏسندو رهيو. پوءِ، هن بنا ڪنهن زور آزمائيءَ جي پنهنجي ويٽي منهنجن هٿن مان ڇڏائي ورتي. چيائين، ”برف ۾ نہ بيهجو. سئمس ۾ وڃي ويهجو. پوري ساڍي ڇهين لڳي مان اوهان کي بڪ گيلريءَ ۾ ملندس.“

مون ڪيس پيار وچان ٻانهن تي ٿڦڪي ڏني. هن پنهنجي ويٽي اڳتي ڪئي. مون پنهنجا ٻئي هٿ سندس ويٽيءَ ۾ وجهي ڇڏيا. اسين ٻئي هڪٻئي ڏانهن ڏسي کلي پياسين. چيم، ”ويٽي ڇڏائي ڏيکار.“

اُداس هو، پر کلي پيو. چيائين، ”نات پاسيبل بابا. نات پاسيبل بابا.“

مون پنهنجا هٿ سندس ويٽيءَ مان ڪڍي ڇڏيا. هو پيراڊائيز سئنيما ۾ هليو ويو.

نعيم پيراڊائيز سئنيما ۾ هليو ويو، پر جهاڳڻ لاءِ مون کي سوچن جو سمنڊ ڏيئي ويو. هن ڪنهن کي ڏٺو آهي! ائين تہ ناهي، مون سوچيو، تہ هن سچ پچ مريم کي ڏٺو آهي! منهنجي ۽ نعيم جي ڪمري ۾ لڳل تصوير ۾ مريم ويهن ڪن سالن جي مس آهي. تڏهن هوءَ مون سان ڪراچيءَ يونيورسٽيءَ

۾ پڙهندي هئي. منهنجي ڪلاس ميٽ هئي. منهنجي زندگيءَ جي سوپيا، ۽ سجاٽپ هئي. منهنجي باري ۾ جڏهن ٻه پچا ڪئي ويندي هئي، تڏهن ڪانئس ٽي پچا ڪئي ويندي هئي. هوءَ جنهن ڏينهن يونيورسٽيءَ ۾ نه ايندي هئي، تنهن ڏينهن ڪوبه مون کي تلاش نه ڪندو هو. سڀني کي خبر هئي ته ان ڏينهن مان به يونيورسٽيءَ ۾ نه هوندس- ان ڏينهن مان ڪلفٽن جي ڪناري سيبريز ريسٽورنٽ ۾ ويٺو هوندس ۽ درياءَ مان ٻيچين سمنڊ ڏانهن ڏسي رهيو هوندس، ۽ ڇولين جي آواز ۾ غزل ٻڌي رهيو هوندس. ان ڏينهن مان ڪرڪيٽ راند لاءِ پريڪٽس تي به نه ويندو هوس. شام جو، ٻڏندڙ سج جي پوين ڪرڻن ۾ ڪناري تان سپيون ۽ ڪوڏ ميڙي ڪٺي ايندو هوس. ان رات دير تائين امان مون کي پيار ڪندي هئي؛ بنا آواز جي روئيندي هئي؛ ۽ منهنجي سک لاءِ آسمانن کان دُعا گهرندي هئي. پر ان ڳالهه کي سڄا سمورا پنجويهه سال گذري ويا آهن- چوٿين صدي! جنهن ۾ هڪ سڄ گرهڻ به شامل آهي، جڏهن ٽاڪ منجهند مهل ڌرتيءَ تي اڌ رات واري اوندهه لهي آئي هئي! پنجويهن سالن کان پوءِ مان به جيڪڏهن مريم کي ڏسان، ته هوند، پهرين نظر ۾ ته شايد ڪيس سڃاڻي نه سگهان! ته پوءِ نعيم ڪيس ڪيئن سڃاڻي ورتو! ڪڏهن ڪڏهن زندگيءَ ۾ امڪان جي حد کان اچي ويندي آهي. ممڪن آهي، نعيم سچ پچ مريم کي ئي ڏٺو آهي، مون سوچيو.

ٻڌو هوم ته هوءَ پنهنجي گهر ۾ سکي آهي، ۽ خوشگوار گهريلو زندگي گذاري رهي آهي. کيس چار ٻار آهن، ۽ سندس مڙس ڪنهن بينڪ ۾ نوڪري ڪندو آهي. ڪيئن هوندي! مون سوچيو. پنجويهن سالن کان پوءِ

مون کي سجاڻي سگهندي! جيڪڏهن مون کي نہ سڃاتائين، يا سڃاڻڻ کان انڪار ڪري ڇڏيائين، تہ مون کي ڏک ضرور ٿيندو، پر مان ان ڏک جو اظهار نہ ڪندس. ان کان وڌيڪ سندس زندگيءَ تي مون کي ڪو بہ اختيار نہ آهي، جو مون سندس هڪ تصوير نعيم جي ڪمري ۾، ۽ ٻئي پنهنجي ڪمري ۾ لڳائي ڇڏي آهي. سندس ٻئي تصويرون ڪراچي يونيورسٽيءَ جي آرٽس فيڪلٽي ۽ لائيبريريءَ جي ٻاهران لان تي نڪتل آهن. هڪڙي ڏينهن مريم جي تصوير ڏانهن غور سان ڏسندي نعيم چيو هو ”منهنجي ماءُ دنيا جي سڀ کان خوبصورت عورت آهي.“

”ها پٽ.“ مان پاسي کان وڃي ويٺو هومانس. چيو هيم، ”تنهنجي ماءُ سچ پچ دنيا ۾ سڀ کان خوبصورت عورت هئي.“

”مون کيس ماري ڇڏيو هو نہ بابا.“ نعيم ڏک وچان پڇيو هو.

کيس پيار ڪندي چيو هوم، ”کهڙيون چرين جهڙيون ڳالهيون پيو ڪرين پٽ. قدرت ائين ئي چاهيو هو تہ هڙ تو کي جنم ڏيڻ کان پوءِ اسان کان ڌار ٿي وڃي.“

ممتا کان محروم ٿيڻ جو ڏک، نعيم جي وجود ۾ عمر سان گڏ، ٻڙ وانگر وڌي وڻ ٿيو آهي. مون کي خبر آهي تہ هو پنهنجي سڄي عمر ممتا موهہ (Mother Fixation) ۾ گذاريندو. هو فقط اُن عورت سان محبت ڪري سگهندو جنهن جي چاهہ مان کيس ممتا جي خوشبوءِ ايندي. ممتا کان محروميءَ جي احساس کي مون سندس شخصيت تي حاوي ٿيڻ نہ ڏنو آهي. سندس محروميءَ جي احساس جي مون پنهنجي بي پناهہ پيار سان تلافي ڪئي آهي.

الاء چو، مان محسوس ڪرڻ لڳس، تہ نعيم جنهن عورت ڪي مريم سمجهيو ۽ پانيو آهي، سان اصل ۾ سچ پچ مريم ئي آهي۔ مريم سان هم شڪل ٻئي ڪا عورت نہ آهي! مون آسمان ڏانهن، ۽ آسمان مان ڪرندڙ برف ڏانهن ڏٺو. پنجويهہ سال اڳ، مريم ڪان هميشہ لاء جدا ٿيڻ وقت مون امڪان لاء جيڪا گنجائش چڏي ڏني هئي، تنهن جي هڪڏينهن اهڙي نموني تڪميل ٿيندي، مون ڪي ان وقت خبر نہ هئي! تڏهن ريڊيو پاڪستان ڪراچيءَ جي ٻاهرين در وٽ مون مريم ڪي چيو هو، ''چگو، خدا حافظ مريم.زندگيءَ ۾ ٻيهر جيڪڏهن مليا سين، تہ برف پوندي ملنداسين.'' اهو نہ واعدو هو ۽ نہ انجام هو، نہ هن طرفان، نہ مون طرفان. ان جملي جي مفهوم تي مون گهٽو پوء جڏهن سوچيو هو، تڏهن ان جملي جي مفهوم ۾ مون ڪي علامت کان سواء ڪجهہ نظر نہ آيو هو. ان جملي جي حوالي سان مون سوچيو هو تہ اسين ٻئي جڏهن اُس بدران درد جي ڇانوَ ۾ پنهنجا وار اڇا ڪري چڏينداسين، تڏهن زندگيءَ ۾ هڪ دفعو ڪٽي نہ ڪٽي، پاڻ ۾ ضرور ملنداسين.

مون آسمان تي ڪاتحرير پڙهڻ جي ڪوشش ڪئي، پر آسمان جي ڪوري ڪاغذ تي مون ڪي ڪابہ تحرير نظر نہ آئي. مون آسماني تحريرن جي ڪاتب سان ڳالهائيندي چيو، ''تون شاهد رهجانءَ تہ مون وفا جي راهن تان ڪڏهن بہ پوئتي هٽڻ جي ڪوشش نہ ڪئي آهي. مون پنهنجي پٽ جي تخيل ڪي مريم جي تصور سان آباد ڪري چڏيو آهي. هو مريم جو پٽ آهي۔مريم ڪان سواء ٻئي ڪابہ عورت هن جي ماءُ نہ آهي.''

برفخاني وانگر سرد، بيحس، ۽ اُداس ڪندڙ ماحول ۾ امڪان جي سرحد

پار ڪرڻ لاء مان مريءَ جي بازارين، دڪانن، رستن ۽ هوٽلن ۾ رلندو رهيس. برف ۽ هوا ۾ مان هلندو رهيس. پنجيتاليهہ-ڇائيتاليهہ سالن جي لڳ ڀڳ هر عورت ڏانهن غور سان ڏسندو رهيس. پنهنجي عمل تي ڪڏهن ششدر، ڪڏهن پشيمان ۽ ڪڏهن دل ئي دل ۾ ڪلندو، ۽ ڪڏهن افسوس ڪندو رهيس.

پوء، جڏهن خوابن جي آخري آرامگاهہ ڪي امر وَلِ وڪوڙي ويئي، تڏهن اوچتو، بڪ گيلريءَ جي هڪ ڪنڊ ۾ مون مريم ڪي بيٺل ڏٺو. دڪان جي ٻاهرين در وٽان مان ڏانهس ڏسڻ لڳس. سندس هٿ ۾ ڪو ڪتاب هو، ۽ هوءَ ڪتاب مان ڪجهہ جملا پڙهندي ۽ صفحا ورائيندي پئي ويئي. گذريل پنجويهن سالن ۾ هوءَ وڌيڪ شانائتي ۽ پرڪشش ٿي پيئي هئي. هوءَ انهن عظيم عورتن مان پئي لڳي، جن کي ڏسڻ کان پوء تقدس جو احساس ذهن جي اُفق تي اُڀري ايندو آهي. دل، جيڪا مدتن کان تمنائن جي تپش کان محروم هئي، ڌڙڪي پيئي. پاڻ کي پرچائڻ، سرچائڻ، ۽ سمجهائڻ جي ڪوشش ڪيم تہ هوء خواب آهي - هن جو حقيقتن سان ڪوبہ تعلق نہ آهي. هوءَ ٻي ڪا عورت آ هي. هوءَ مريم نہ آهي. علامتن کان ايتريقدر ظاهر ۽ واضح معنيٰ نہ ملندي آهي. سوچيم تہ هليو وڃان. ڪليسا جي ٻاهرين پٽ وٽ بيهي، برف جي صليب ڏانهن ڏسندو رهان. پر، مان ائين ڪري نہ سگهيس. زندگي جيڪڏهن خود- فريبيءَ جو شڪار نہ ٿئي ها، ۽ خوابن تي جيڪڏهن حقيقتن جو گمان ٿئي ها، تہ هوند، مان ڪيس نظر جو دوکو سمجهي نظرانداز ڪري ڇڏيان ها. تڏهن، اڻپورين تعبيرن جي بارگاهہ ۾ سجدو نہ ڪريان ها. بڪ گيلريءَ جي در وٽان هٽي وڃان ها-برف جي ڪفن

تي هلندو رهان ها. پر، هوءَ خواب نہ هئي. هوءَ منهنجي ۽ نعيم جي نظر جو دوکو نہ هئي. هوءَ منهنجي زندگيءَ جي روشني هئي. هوءَ منهنجو تشخص هئي. هوءَ منهنجي سچائپ هئي. ڪيئن ڪيس نظرانداز ڪري هليو وڃان ها! پهرين دوري کان پوءِ هينئر دل جي رفاقت تان اعتبار کڄي ويو آهي. مون محسوس ڪيو تہ زندگي ۾ فقط هڪ دفعو امڪان جي حد هٿ ايندي آهي. برف پوندي زندگيءَ ۾ فقط هڪ دفعو ملاقات ٿيندي آهي. برف پوندي ملاقات ٿي نہ سگهندي آهي!

مان سندس سامهون وڃي ويٺس.

هن ڪنڌ مٿي ڪري مون ڏانهن ڏٺو.

فقط هڪ لمحي لاءِ نظرون ڦيرائي ڪتاب تي ڄمائي ڇڏيائين. سندس سامهون ويٺو رهيس. ڏانهنس ڏسندو رهيس. سندس مٿي جا وار ذري گهٽ اڇا ٿي ويا هئا. سندس پيشانيءَ تي وقت جي وهنوار جا ليڪا ظاهر ٿي پيا هئا. عينڪ جي شيشن پٺيان سندس عميق اکيون گهري سوچ ۾ ٻڏل هيون.

هن ڦيرائي ڪنڌ مٿي ڪري مون ڏانهن ڏٺو. ۽ پوءِ ڄڻ ڪانئس ڇرڪ نڪرندي نڪرندي رهجي ويو. سندس هٿ مان ڪتاب ذرگهٽ ڇڏائجي ويو. هوءَ ٽڪ ٻڌي مون ڏانهن ڏسندي رهي. جهيڻي آواز ۾ سندس نالو ڪنيم. چيم، ”مريم“.

خشڪ چپن تي اڻ لکي مُرڪ تري آيس. ڪجهہ اچرج، ڪجهہ تعجب وچان مون ڏانهن ڏسندي رهي. دڪان کان ٻاهر ڪيهہ جهڙي ڪوئري برف آسمان مان ڪرندي رهي. تير وانگر لڱندڙ هوا هلندي رهي.

جهيڻي آواز ۾ ڪانئس پڇيم، ”ڪيئن آهين، مريم؟“

جواب نہ ڏنائين، ورائي پڇيائين، ”تون ڪيئن آهين؟“

سمجهان ٿو، منهنجن چپن تي هڪ بلڪل بي معنيٰ مرڪ تري آئي هئي.

چيم، ”مان ٺيڪ آهيان.“

ڪتاب ڪائونٽر تي رکندي چيائين، ”ورهيہ وهامي ويا آهن.“ چيم ”چوٿين صدي۔ پورا پنجويهہ سال.“

پنهنجي ساءِ چيائين، ”ها. پورا پنجويهہ سال.“

پڇيم، ”تون ڪيئن آهين، مريم.“

”مان!“ هوءَ مون ڏانهن ڏسندي رهي. پوءِ چپن تي ڏاڍي اداس مرڪ ليئو پائي موٽي ويس. چيائين، ”مان خوش آهيان۔ ٺيڪ آهيان“۔

”تو کي ڪيئن ٿي لڳان!“

ڪجهہ گهڙيون ماٺ ڪري ڏانهس ڏسندو رهيس. پوءِ چيم، اڌ اڌ رات جو اٿي مون تنهنجي سک لاءِ ٻاڏايو آهي ”مريم.“

هوءَ هيڏانهن هوڏانهن ڏسڻ لڳي. اکين ۾ تري آيل وجود جي ڇوليءَ جي اُڇل مون کان لڪائڻ لڳي.

چيم، ”گهڻو اڳ، تو کي ڏسڻ ۽ توسان گهڙي ڪن لاءِ ملڻ جي مون پروردگار کان دعا گهري هئي.“

آواز ڳورو ٿي پيو.

هن ڪجهہ نہ چيو.

مون چيو، ”دعا ائين اگهامندي، مونکي خبر نہ هئي.“ ڪائونٽر تي رکيل ڪتاب ڪاغذ جي ڳوٿريءَ ۾ وجهي، سيلزمين ڏاڍي ادب سان آٽي مريم کي ڏنو. هن پرس مان ڪجهہ نوٽ ڪڍي سيلزمين کي ڏنا.

چيو، ”تو ڏانهن ايندي سوچيو پئي، شايد، مون کي سڃاڻي نه سگهين.“

سيلزمين کيس بچيل پيسا موٽائي آڻي ڏنا. هن بنا ڳڻڻ جي پيسا پرس ۾ رکي ڇڏيا. پوءِ مون ڏانهن ڏسندي پڇيائين، ”ائين ڇو سوچيو هئيءِ؟“

چيو، ”پنجويهن سالن جو عرصو ڪو گهٽ ته ڪونهي“. ”تمام گهٽ آهي- تمام گهٽ آهي.“ ڏاڍي ڏک وچان چيائين، ”تو کي خبر نه آهي. تمام گهٽ آهي. وسارڻ لاءِ تمام گهٽ آهي.“

مريم جي اکين ۾ لڙڪ لڙي آيا. هيٺيون چپ ڪنبڻ لڳس. ڪاڏيءَ ۾ ڳپ پئجي ويس. پنهنجي ساءِ چيائين، ”زندگيءَ جي هيڏي وڏي الميي کي وسارڻ لاءِ پنجويهن سالن جو عرصو تمام گهٽ آهي- تمام گهٽ آهي.“

هن دڪان کان ٻاهر آسمان ڏانهن ڏٺو-ڄڻ پروردگار سان شڪايت ڪندي هجي!

پر پوءِ ضبط ڪري ورتائين. پڇيائين، ”اسين ائين ئي بيٺا هونداسين ڇا!“ اُداس چپن تي ويران مُرڪ جي روشني پکڙجي ويس. هوءَ بي انتها سهڻي آهي-شانائتي آهي. پر ان ڏينهن اُداس ٿيڻ کان پوءِ، ڪائنات جو سمورو حسن سندس شخصيت ۾ شامل ٿي ويو. پڇيائين، ”مون سان هڪ ڪوپ ڪافيءَ جو نه پئيندين؟“

بڪ گيلريءَ مان نڪري برف سان ڀريل مال روڊ تي اچي بيٺاسين. مون ٽرنيٽي چرچ جي صليب ڏانهن اشارو ڪندي چيو، ”مان هن صليب تي لٽڪيل آهيان، مريم.“

مريم ڪنڌ ڪڍي برف سان ڍڪيل صليب ڏانهن ڏٺو. پڇيائين، ”افسوس

تو ٿيئي پنهنجي فيصلي تي!“

”الاءِ. ڪجهہ چئي نہ ٿو سگهان.“ مريم ڏانهن ڏسندي چيم، ”تو ڪان جدا ٿيڻ ڪان پوءِ مون زندگيءَ کي تهمت طور قبول ڪيو آهي.“

سندس منهن تي هڪدم غم جو پاڇو پئجي ويو. هن منهن ٻئي طرف ڪري ڇڏيو. گهڙي ڪن لاءِ مون سندس ڪلها ڪنبندي ڏٺا.

”مريم.“ مون ڪيس سڏ ڪيو.

هن منهن ورائي مون ڏانهن ڏٺو. اکين ۾ آلاڻ هئس. ڪلڻ جي ڪوشش ڪندي چيائين، ”خبر اٿئي، مونکي ٻہ دفعا نمونيا ٿي چڪي آهي.“

لنٽانس ريسٽورنٽ جي هڪ ڪنڊ ۾ ويهڻ لاءِ اسان کي ٽيبل ملي ويئي. هڪٻئي جي آمهون سامهون ويهي رهياسين. بيرو ڪافيءَ جو آرڊر وٺي هليو ويو. جڏهن ڳالهائڻ ۽ پڇڻ لاءِ گهڻو ڪجهہ هوندو آهي، تڏهن لفظ جملن جي جوڙجڪ مان نڪري ويندا آهن. تڏهن، گفتگوءَ جي شروعات هٿ نہ ايندي آهي. اٽڪڻ هئي. ڪانئس پڇيم، ”مون سان ڪافي پيئندي- منهنجو مطلب آهي، تنهنجو گهر وارو محسوس تہ نہ ڪندو، ريسٽورنٽ ۾......“

”قطعي نہ.“ مريم تمام پختي لهجي ۾ چيو، ”هن کي تنهنجي باري ۾ خبر آهي.“

تعجب وچان چيم، ”خبر آهي!“

”ها.“ وراڻيائين، ”نہ هن اِن باري ۾ مون کان ڪڏهن صفائي گهري آهي، ۽ نہ مون ئي ان باري ۾ کيس وڌيڪ ڪجهہ ٻڌائڻ جي ضرورت محسوس ڪئي آهي.“

مون اُن شخص لاءِ دل ۾ عزت محسوس ڪئي.

۽ پوءِ، ڪلندي چيائين،” هينئر تہ مان پوڙهي ٿي ويئي آهيان. ڇٺن جوان ٻارن جي ماءُ آهيان.“

ڇٺن ٻارن جي جملي مون ۾ ڪي حال مان ڪڍي ماضيءَ ڏانهن ڌڪي ڇڏيو. مريم ڪي ٻار ڏاڍا وڻندا هئا. يونيوسٽيءَ جي بس مان لهي، جڏهن گرو مندر وٽ بيهي رهندا هئاسين،تڏهن هوءَ فرابيل ڪنڊر گارٽن اسڪول مان موٽندڙ ٻارن ڪي رستي تي روڪي روڪي پيار ڪندي هئي. ڪين پرس مان ٽافيون ڪڍي ڏيندي هئي. يونيورسٽيءَ ۾ تہ ڪنهن ڪنهن وقت عجيب صورت حال پيدا ڪري وجهندي هئي. يونيورسٽيءَ جي هڪ پنگيءَ برڪت جي ٻن سالن جي پٽ کي کڻي ڪينٽين ۾ اچي ويهندي هئي. ڪيس بسڪوٽ ۽ ٽافيون کارائيندي هئي، ۽ ڪوپ ۾ کير وجهي پيئاريندي هئي. هڪڙي ڏينهن، جڏهن اسين ٻئي گرومندر جي بس اسٽاپ وٽ بيٺا هئاسين، تڏهن مريم چيو هو، ”مان گهٽ ۾ گهٽ ڇهن ٻارن جي ماءُ ٿينديس ـ ٽي پٽ ۽ ٽي ڌيئر.“ ۽ پوءِ، هوءِ ڪيترن ڏينهن تائين پنهنجي جملي تي شرم کان ڳاڙهي ڳاڙهي ٿيندي رهي هئي، ۽ مون ڏانهن ڏسي نہ سگهندي هئي.

”ڇا پيو سوچين؟“ مريم پڇيو.

حال ڏانهن موٽندي چيم، ”ڪجهہ نہ ـ ڪجهہ خاص نہ بس ائين ئي.“

پڇيائين،”مون کان لڪائين تہ نہ ٿو؟“

چيم ”منهنجي لاءِ ممڪن ئي نہ آهي.“

بيرو ڪافي کڻي آيو.

ڪافي ٺاهيندي پڇيائين، ”ٻڌاءِ، اسلام آباد ۾ نوڪري

ڪندو آهين؟“
ها ڪار ۾ ڪنڌ لوڏيم.
پڇيائين،”ڪهڙي محڪمي ۾؟“
مون ڪيس محڪمي جو نالو ٻڌايو.
ڪافيءَ جو ڪوپ منهنجي اڳيان رکندي ڏاڍي عجيب ڳالهه پڇيائين، ”ٻڌو هوم، سمجهان ٿي افواهه ئي هو، هڪ ڀار واري ڪنهن عورت سان شادي ڪئي هيءِ!“
ورائي پڇيو مانس، ”يقين ڪيو هيءِ ان ڳالهه جو؟“
چيائين ”بلڪل نه.“
ڪافيءَ جي ڪوپ مان سپ پريندي چيم، ”مون کي پنهنجي باري ۾ ٻڌاءِ، مريم.“
”ڇو؟“ منهنجين اکين ۾ ڏسندي پڇيو هئائين.
”ڇو جو، ماڻهن بدران مان تنهنجي واتان ٻڌڻ چاهيان ٿو.“ چيم،”مون کي پنهنجي باري ۾ ٻڌاءِ.مان پاڻ کي ڪنهن ڪنهن وقت تنهنجو مجرم محسوس ڪندو آهيان.“
سوچ ۾ پئجي ويئي. نرڙ تي انيڪ ليڪون اڀري آيس.پوءِ، اهڙي لهجي ۾،جڻ خواب ۾ ڳالهائيندي هجي،چيائين،”منهنجو گهر وارو سکر ۾ بينڪ مئنيجر آهي - نيشنل بينڪ ۾ آهي.ٽيويهه سال ٿي ويا آهن منهنجي شاديءَ کي.ٻه پٽ ٻه ڌيئرون ٿيون آهن. هڪ پٽ مرچنٽ نيويءَ ۾ آهن، ۽ سال ۾ اٺ مهينا گهر کان ٻاهر رهندا آهن.ٻئي ڌيئر نواب شاهه ميڊيڪل ڪاليج ۾ آهن-وڏي ٽئين سال ۾ ننڍي ٻئين سال ۾ آهي. بس.“

سندس لهجو اوپرو، جملاٽنل ٿنل، ۽ آواز منجهيل منجهيل هو. ڪافيءَ جي ڪوپ مان ٻه چار دفعا سپ ڀري ورتائين. پوءِ پنهنجي ساءِ چيائين، ”بس نه.“

ٿڌو ساهه کنيم. چيم، ”مون کي پنهنجي باري ۾ ٻڌاءِ.“

وري گهور وجهي مون ڏانهن ڏٺائين. پوءِ، جهيڻي آواز ۾ چيائين،”مان پنهنجي گهر ۾ خوش آهيان_حالتن ۽ ماحول کان مطمئن آهيان.“

پڇيم،”ڪنهن ڪاليج ۾ پڙهائيندي آهين؟“

”ها.“ چيائين،”شڪارپور ڪاليج ۾ پڙهائيندي آهيان. روزانو سکر کان شڪارپور ايندي ويندي آهيان. اڄڪلهه موڪلون آهن. چوڪرين کي مري ۽ ايوبيا گهمائڻ آئي آهيان.“

خاموشيءَ جو هڪ طويل لمحو آيو ۽ ترسي پيو. اسين ڪنڌ جهڪائي ڪافيءَ جي ڪوپ مان سپ سپ ڀريندا رهياسين. سوچيندا رهياسين. وقت جي قديم آثارن مان يادن جي ميراث ميڙيندا رهياسين. هٿ زخمي ڪري وڌاسين. تڏهن، مريم چيو،” هڪ غلط فيصلي جي سزا پاڻ کان سواءِ ٻين کي به ڀوڳڻي پوندي آهي، جن جو ان سموري معاملي سان ظاهري طرح ڪوبه تعلق نه هوندو آهي.“

مون ڏانهس ڏٺو. ڏک ۽ اذيت جو احساس اکين مان ظاهر ٿي رهيو هوس چيائين،”مان هڪ شخص جي زال آهيان - سندس ڇهن ٻارن جي ماءُ آهيان_پر منهنجو روح ٻئي ڪنهن شخص لاءِ سرگردان آهي.“

چيم،”هڪ خواهش جي تڪميل کان پوءِ، ٻئي اڻ پوري خواهش جو ارمان وڌي ويندو آهي.“

گهور وجهي مون ڏانهن ڏٺائين. چيائين، ”تون ڪنهن ڪنهن وقت افلاطون ٿي پوندو آهين. اها تنهنجي پراڻي عادت آهي.“

ڏکن جي ڏيهه ۾ هڪ گهڙي لاءِ مُرڪ مونٽي آئي. چيم، ”تنهنجو جملو مون کي وڻيو آهي. ورهين کان ان جملي لاءِ واجهايم پئي.“

دريءَ کان ٻاهر ڏسندي چيائين،” تنهنجي لاءِ ممکن ئي نه آهي“

وراڻيم، ”ڇاممڪن نه آهي؟“

وراڻيائين، ”ٻئي جي محبت جو انت لهڻ.“

سندس جملو ٻرڇيءَ وانگر منهنجي وجود ۾ لهي ويو. چيم، ”تو کان جدا ٿيڻ جو ڏک منهنجي زندگيءَ جو لازمي حصو ٿي پيو آهي.“

حسرت اکين ۾ تري آيس . چيائين،” تنهنجو فيصلو غلط هو.“

”فيصلو منهنجو نه، ڊاڪٽرن جو هو.“ چيم،”مون سان شادي ڪرڻ کان پوءِ تون ڪڏهن به ماءُ ٿي نه سگهين ها.“

”تون سمجهين ٿو،مان ان ڳالهه کان واقف نه هئس - بي خبر هئس!“ ڪجهه ڪجهه ناراض ٿيندي چيائين، ”مان تڏهن انڪلسيريا نرسنگ هوم ۾ موجودهئس، جڏهن مختلف ليباريٽري ٽيسٽن کان پوءِ ڊاڪٽرن ان جي باري ۾ تصديق ڪئي هئي.“

اوچتو، گوڙشور سان ڀريل ريسٽورنٽ ۾ خاموشيءَ جو راڪاس گهمي ويو.ماٺ! موت جهڙي ماٺ!سانت جي گنبذ ۾ ماضيءَ جي تصويرن جا اولڙا، ۽ آوازن جا پڙاڏا واضح ٿيڻ لڳا! اذيتن جون راتيون، ۽ اذيتن جا ڏينهن واپس ورڻ لڳا! مان آوازن جو پڙلاءُ ٻڌي سگهان ٿو - تصويرن جو اولڙو ڏسي سگهان ٿو! ايوب خان جو اوائلي دور آهي.مشرقي پاڪستان جي

مقابلي ۾ مغربي پاڪستان جي چئن صوبن کي ملائي ون يونٽ ڪڙو ڪيو ويو آهي. هنگامن جي شروعات ڪراچي يونيورسٽيءَ کان ٿي آهي. مظاهرا ٿي رهيا آهن. جلسا، جلوس، ۽ هنگاما هلي رهيا آهن.وٺ پڪڙ هلي رهي آهي.وَن يونٽ اسان کي قبول نہ آهي. اسان ڪلاسن جو بائڪاٽ ڪري ڇڏيو آهي.يونيورسٽيءَ جا استاد هليا ويا آهن. اسين جوش ۽ جنون ۾ يونيورسٽيءَ جي ڪاريڊارن ۾ هلي رهيا آهيون.يونيورسٽي ڏانهن ايندڙ سمورن رستن کي اسان ڇپن، پٿرن ۽ پراڻن ٽائرن کي باهہ ڏيئي بند ڪري ڇڏيو آهي.هي ڪير آهن! هي ڪير آهن جن يونيورسٽيءَ جو گهيراءُ ڪيو آهي! هي ڪير آهن! هو هر طرف کان اسان ڏانهن وڌي رهيا آهن. هو آوازن جا دشمن آهن. هو سوچ جا دشمن آهن هو اظهار جي آزاديءَ جا دشمن آهن. هنن مون کي کهڙي هنڌ آڻي قيد ڪيو آهي! هيءَ رات ايڏي طويل ڇو آهي_ايتري ڊگهي ڇو آهي. هنن مون کي ڇا ڪيو آهي جو مان ويهي نہ ٿو سگهان_ مان ڪجهہ بہ چڱيءَ طرح ڏسي نہ ٿو سگهان. مون کي پيٽ ۽ پاسرين وٽ تڪليف آهي_ هنن مون کي ڇا ڪيو آهي! مون کي ڪجهہ بہ ياد نہ آهي ـ ڪجهہ بہ ياد نہ آهي. هنن مون کي ڏاڍو ٽارچر ڪيو آهي.(1)

بس ڏاڍو ٽارچر ڪيو آهي.

مون کي ٽارچر سبب ڪيترن ڏينهن تائين گڙدن مان گند ايندو رهيو هو.تڏهن،علاج دوران جڏهن گڙدن مان ايندڙ گند بند نہ ٿيو، ۽ طرحين طرحين جا ليبارينٽري ٽيسٽ ٿيندا رهيا، تڏهن ڊاڪٽر کي هڪ خبر اِها بہ پيئي تہ مان ڪنهن بہ ٻار جي جنم جو سبب ٿي نہ سگهندس.

”ڇا پيو سوچين؟“ مريم پڇيو.

چيم، ”مون سان شادي ڪري تون خوش رهي نہ سگهين ها.“

”پنجويهن سالن کان پوءِ ان باري ۾ ڳالهائڻ فضول آهي.“

مريم چيو، ”پر تنهن هوندي بہ مان سبب ٻڌڻ چاهيان ٿي.“

چيم، ”ياد اٿئي، يونيورسٽيءَ کان موٽندي، گرومندر وٽ هڪ دفعي تو چيو هو تہ مان ڇهن ٻارن جي ماءُ ٿينديس.“

هوءَ اوچتو ويراڳڻ ٿي پئي. بنواس جي ڪنهن هيڪل مسافر وانگر نظر اچڻ لڳي. مون ڏانهن ڏسندي رهي. خاموش رهي.

آهستي چيم، ”ماءُ نہ ٿي سگهڻ جو افسوس تو ڪي پيچي پورا ڪري ڇڏي ها.“

ٿڌو ساهہ کنيائين. چيائين، ”هيءُ ڏک بہ ڪو گهٽ تہ ڪونهي.“

مون شدت سان محسوس ڪيو تہ اسين تمنائن جو هڪ نہ، بلڪ انيڪ صليب ڪلهي جيئرا رهندا آهيون. مريم ڏک وچان مون ڏانهن ڏٺو. ڪنبندڙ هٿ سان ڪافيءَ جو ڪوپ چپن تائين کڻي ويئي، پر ڪافيءَ جي سڀ پيري نہ سگهي ڪوپ ٽيبل تي رکي ڇڏيائين، ڪجهہ دير کان پوءِ چيائين، ”اسين ڪوٻار وٺي پاليون ها.“

مون کي ائين محسوس ٿيو، ڄڻ زلزلو آيو، ۽ سڀ ڪجهہ ڌرتيءَ داخل ڪري ويو. مان اٿي، وچي دريءَ وٽ بيٺس. ٻاهر ڏسڻ لڳس. مريءَ جو سمورو شهر برف جي ڪفن سان ڍڪجي ويو هو. مان پنهنجي وجود ۾ اندر ئي اندر پرزا پرزا ٿيندو رهيس. ڪجهہ دير کان پوءِ مريم منهنجي پاسي کان اچي بيٺي. منهنجي ڪلهي تي هٿ رکيائين. مون ڏانهس ڏٺو. چيائين، ”اچ.“

اسين موٽي وچي ڪرسين تي ويٺاسين.

چيائين،’’ان امڪان تي مون وانگر شايد نہ سوچيو هُيءِ.‘‘ چيمر، ’’سوچيمر هيمر، پر دير سان۔ تنهنجي شادي ٿي وڃڻ کان پوءِ.‘‘

’’پوءِ؟‘‘ هن عجيب سوال ڪندڙ نگاهن سان مون ڏانهن ڏٺو. چيمر،’’مان هڪ جوان پٽ جو پيءُ آهيان مريمر.‘‘

وائڙي ٿي ويئي. اک نہ ڇنڀيائين. لفظ جملي مان نڪري نڪري پئي ويس،’’تون تہ، منهنجو مطلب آهي - ڪٿان، ڪنهن کان ورتو اٿئي! ڪير آهي!‘‘

سندس اکين ۾ ڏسندي چيمر، ’’هو تنهنجو ۽ منهنجو پٽ آهي. تون هن جي ماءُ آهين، مريمر.‘‘

اُٿن وڌي ويس، پڇيائين،’’پر ڪير آهي.‘‘

’’هو منهنجو پٽ آهي، مريمر، منهنجو پٽ آهي. مان هن جو پيءُ آهيان.‘‘ چيمر، ’’۽ تون هن جي ماءُ آهين. ڪيس جنمر ڏيڻ کان پوءِ تون مري ويئي آهين.‘‘

حيرت ۽ اچرج وچان اکيون وڏيون ٿي ويس.’’پر ڪنهن کان ورتو اٿئي!‘‘ پڇيائين.

’’ڪنهن کان بہ نہ.‘‘ چيمر،’’هو منهنجو پٽ آهي مريمر. تون يقين ڇو نہ ٿي ڪرين تہ هو منهنجو پٽ آهي، مان هن جو پيءُ آهيان.‘‘

هن منهنجو هٿ پنهنجن ٻنهي هٿن ۾ جهلي ورتو. منهنجين اکين مان منهنجي وجود جو انت لهڻ لڳي. آهستي پڇيائين:’’مون کي بہ نہ ٻڌائيندين.‘‘

سندس اکين ۾ ڏنمر. اکين ۾ التجا هئس. چاٽڻ لاءِ اُتڻ هئس. اڄ تائين

مون کهڙي ڳالهہ کانئس لکائي آهي! کهڙي راز جي مون کانئس پرده داري ڪئي آهي!ٻڌائي ڇڏيانس سڀ ڪجهہ۔ سڀ ڪجهہ؟ ٻڌائي ڇڏيانس تہ نعيم ڪير آهي! هو منهنجي زندگيءَ ۾ ڪيئن داخل ٿيو آهي! ڪيئن مون کيس پنهنجو رت ست ڏيئي پندرهن ڏينهن جي پونگري مان پالي جانئو جوان ڪيوآهي! ٻڌائي ڇڏيانس تہ مون کيس لاوارث ٻارن جي اجهي ڪاشانہ اطفال مان ورتو هو ۽ ڪاشانہ اطفال وارن کي هو سولجر بازار جي پارڪ مان لڌو هو! ٻڌائي ڇڏيانس سڀ ڪجهہ! ٻڌائي ڇڏيانس تہ يونيسيف جو امدادي سامان ڏيندي ڪاشانہ اطفال ۾ مون جڏهن نعيم کي ڏٺو هو تڏهن مون پنهنجي روح، پنهنجي وجود ۾ ڇا محسوس ڪيو هو! مون کي محسوس ٿيو هو، تہ هو منهنجي ئي وجود جو حصو هو۔هو منهنجي تڪميل هو،مان هن جي تڪميل هوس.هو منهنجو ئي پٽ هو جنهن ٻئي هنڌ جنم ورتو هو.مون کيس سڃاڻي ورتو هو.مون سندس اون آن جو آواز سڃاڻي ورتو هو، هو منهنجو پٽ هو.ان ۾ ڪنهن قسم جي شڪ شبهہ جي ضرورت نہ هئي.هو منهنجي لاءِ، ۽ مان هن لاءِ دنيا ۾ آيو هوس.مان جيڪڏهن ڪنهن ٻار جي جنم لاءِ سبب جهڙو هجان ها، ۽ مريم سان شادي ڪريان ها، تہ مان مون کي هوبهو هن جهڙو ٻار ٿئي ها۔هوبهو هن جهڙو! هن جون اکيون مريم جي اکين جهڙيون آهن. هو فقط ٻن هفتن جو مس آهي، پر مون کيس سڃاڻي ورتو آهي.هو منهنجو ۽ مريم جو پٽ آهي!اِها ڪا ايڏي وڏي ڳالهہ نہ آهي تہ هن ڪٿي جنم ورتو آهي.سڀ کان اهم ڳالهہ آهي احساس جي۔احساس جي يقين جي! هو منهنجو پٽ آهي.هو مريم جو پٽ آهي.هو اسان ٻنهي جو پٽ آهي.اهو سچ آهي۔ باقي، ان کان سواءِ، ڪجهہ بہ سچ نہ

آهي. هو منهنجو وارث آهي، مان هن جو مورث آهيان.اهو طي آهي.ان جو فيصلو آسمانن تي ٿي ويو آهي.زمين جو ڪوبہ ڪاتب ان فيصلي جي خلاف هڪ سٽ لکي نہ سگهندو.

''هو منهنجو پٽ آهي مريم، منهنجو پٽ آهي.''سندس اکين ۾ ڏسندي چيم،''اسين آسمانن جي تحرير پڙهي نہ سگهندا آهيون. اسان ٽنهي جو - تنهنجو، منهنجو ۽ نعيم جو دستاويز لوح ۾ محفوظ آهي.ان ۾ ڪنهن بہ قسم جي ڦير گهير جي گنجائش نہ آهي. هوتنهنجو ۽ منهنجو پٽ آهي.''

مريم ڪجهہ ڪجهہ وائڙي ٿي ويئي.مان سمجهان ٿو، ڪيس منهنجي هوشمنديءَ تي شڪ ٿيڻ لڳو هو. هن پيار وچان منهنجي هٿ تي ٿڦڪي ڏني، اهڙي نموني جڻ چوندي هجي، مان سڀ سمجهان ٿي: مان سڀ ڪجهہ سمجهي سگهان ٿي، تون مون کي ڪابہ سمجهاڻي نہ ڏني_مان تنهنجي دل جي ڪيفيت ڄاڻان ٿي.

''هو تنهنجو ۽ منهنجو پٽ آهي مريم.'' مون سندس اکين ۾ ڏسندي چيو، ''ڪيس جنم ڏيڻ کان پوءِ تون مري ويئي آهين.''

هوءَ ٽڪ ٻڌي مون ڏانهن ڏسندي رهي. غم جي ڇانوَ مريم جي وجود مٿان ڇانئجي ويئي.

''ها. ڪيس جنم ڏيڻ کان پوءِ مان مري ويئي آهيان.'' ڏاڍي ڏک وچان چيائين،''مان ئي هن جي ماءُ آهيان. هو سچ پچ منهنجو پٽ آهي.''

خاموشي ڇانئجي ويئي.خارجي آوازن سان رشتو ختم ٿي ويو. اسين هڪٻئي جي سيني ۾ ڌڙڪندڙ دل جو ٻڌندڙ آواز ٻڌي رهيا هئاسين.

پنهنجي ساءِ چيائين،''ڪيس جنم ڏيڻ کان پوءِ مان مري ويئي آهيان.''

اکين ۾ لڙڪ لڙي آيس. منهنجو هٿ ڇڏي ڏنائين. پرس مان رومال ڪڍي اکيون اگهي ڇڏيائين.

دل اداس هئي. چيم، ''تنهنجي هڪ تصوير نعيم جي ڪمري ۾ ٻئي پنهنجي ڪمري ۾ لڳائي ڇڏي اٿم. يونيورسٽيءَ واري دور جون تصويرون آهن.''

پڇيائين، ''منهنجي باري ۾ ٻيو ڇا پڇندو آهي؟''

''گهٽو ڪجهه_تمام گهٽو.'' چيم، ''هو روزانو تنهنجي باري ۾ ڳالهائيندو آهي.'' ويهن سالن کان ان دستور ۾ تبديلي نه آئي آهي.

هوءَ سوچ ۾ جذب ٿي ويئي. وري خاموشيءَ جو ڇڙ هڪ پهر گذري ويو.

''قائداعظم يونيورسٽيءَ مان انٽرنيشنل رليشنز ۾ ايم اي ڪري رهيو آهي.'' چيم، ''مڊل ويٽ باڪسر آهي. جيڪي انيڪ ڪپ ۽ ٽرافيون کٽيون اٿائين، تنهنجي تصوير هيٺان سائيڊ بورڊ تي رکي ڇڏيون اٿائين.''

هيٺيون چپ ڏندن هيٺان پيڪوڙي ڇڏيائين. ڪجهه دير تائين دريءَ کان ٻاهر ڪرندڙ برف ڏانهن ڏسندي رهي. سوچيندي رهي. اندر ۾ جهجهندي رهي.

چيم، ''ڪجهه دير اڳ هن تو کي ڪينٽ شاپنگ سينٽر ۾ ڏٺو هو.''

تعجب و چان مون ڏانهن ڏنائين. ڪجهه نه چيائين.

چيم، ''هن تو کي سچاڻي ورتو هو.''

''سچاڻي ورتو هو!'' ڏاڍي عجب و چان پڇيائين.

''تنهن جو تصور سندس ذهن ۾ جيئرو جاڳندو واضح آهي.'' چيم، ''موٽي اچي مون کي ٻڌايائين ته مون هڪ اهڙي عورت ڏٺي آهي، جيڪا

هوبهو امان جهڙي آهي-بس ڪجهه ڪجهه امان ڪان پوڙهي آهي.“

پوئين جملي تي مرڪ هڪ پل لاءِ سندس چپن تي موٽي آئي. پڇيائين،”تو ڇا محسوس ڪيو هو؟“

چيم،”مون محسوس ڪيو هو تہ اُها هوبهو عورت تون ئي آهين جنهن کي نعيم ڏٺو آهي.“

پڇيائين،ائين ڇو محسوس ڪيو هيءَ؟

”الاءِ،مون کي خبر ناهي،چيم،پر، مون محسوس ڪري ورتو هو تہ نعيم تو کي ئي ڏٺو آهي، ٻئي ڪنهن عورت کي نہ ڏٺو آهي.“

پڇيائين،”ڪٿي آهي؟“

چيم،”پيراڊائيزم ۾ باڪسنگ جي فلم ڏسڻ ويو آهي.“ڪنڌ هيٺ ڪري ڪجهه سوچيائين.پوءِ ڪنڌ مٿي ڪندي چيائين، ”مان پنهنجو پٽ ڏسڻ چاهيان ٿي.“

مون کان ذري گهٽ ڇرڪ نڪري ويو. مريم هڪدم منهنجي ڪيفيت پرکي ورتي.عزم واري لهجي ۾چيائين،”مان کيس ملنديس، کيس ڏسنديس.“

”هو منهنجي زندگي آهي، مريم - منهنجو خواب آهي.“ٻڌ ٽرَ واري ڪيفيت ۾چيم، ”عمر جي هن حصي ۾ جيڪڏهن کيس اصل حقيقت.......“

منهنجو جملو کپي ڇڏيائين. چيائين،”مان ڄاڻان ٿي - سمجهان ٿي، تڏهن تہ کيس ملڻ چاهيان ٿي.“

مون کي تعجب ٿيو.

مريم چيو،”مان چاهيان ٿي تہ هو مون کي ڏسي۽يقين ڪري تہ مان سندس ماءُ نہ آهيان۔ مان هوبهو سندس ماءُ جهڙي ٻئي ڪا عورت آهيان۔ٻئي ڪا عورت آهيان۔اوپري، پرائي.“

مون کي مريم تي ڏاڍو رحم آيو. محبت جي نالي ۾سهڻ ۽ جهاڳڻ لاء مون کيس سوچن جو بنواس ڏيئي ڇڏيو هو.صليب فقط مون نہ کنيو هو.صليب مريم بہ کڻي ورتو هو.هن جي آزمائش منهنجي آزمائش کان وڌيڪ سخت، ۽ روح فنا ڪندڙ هئي.هوء هڪ شخص جي زال ۽ سندس ٽئن ٻارن جي ماءُ هئي.

”فلم تان ڪڏهن موٽندو؟“ مريم پڇيو.

چيم،”ساڍي ڇهين لڳي مون کي بڪ گيلريءَ ۾ ملندو.“

واچ ۾ وقت ڏٺائين. چيائين،”سوا ڇهہ ٿيا آهن.“

مان خاموش رهيس.مريم ڪنڌ کڻي مون ڏانهن ڏٺو.دل جَذبَ جي پڙن ۾ ڇڄر جي ويئي. سوچيم،برف ۾ ملڻ جي دعا زندگيءَ ۾ فقط هڪ دفعو قبول ٿيندي آهي۔ فقط هڪ دفعو مان وري ڪڏهن بہ مريم سان ملي نہ سگهندس: نہ زندگيءَ جي سَرَءُ ۾، ۽ نہ سياري ۾ ياد جي پيچرن ۾، سڪل پنن تان ڪنهن جي قدمن جا آواز ٻڌڻ ۾ ايندا ۽ هوا ۾ منتشر ٿي ويندا. فقط ساوڻ ۾ ڪٽبن تان مٽيءَ جا تهہ ڌوپجي لهندا، پر اسان جي تحرير پڙهڻ وارو ڪونہ هوندو.اسان جو نوحو ٻڌڻ وارو ڪوبہ نہ هوندو ۽ نہ اسانجي ملڻ ۽ وڇڙڻ جي تاريخ، ڏينهن، وقت ۽ سن ڏسڻ وارو ڪو هوندو! زندگيءَ جو هڪ دور گذري ويندو. اسان جي جاء ٻيو ڪو والاريندو. جيڪڏهن ائين نہ هجي ها، تہ هوند، پيرويءَ جي سُرن ۾ايترو درد نہ هجي ها.

بيروبل وٺي هليو ويو.

اسين، زندگيءَ ۾ پيهر جدا ٿيڻ لاءِ اٿي بيٺاسين. هڪٻئي ڏانهن ڏسندا رهياسين. ورهين جي وڇوڙي ۾ دفن ٿيندا رهياسين. پنهنجي پنهنجي وجود ۾ پرزا پرزا ٿيندا رهياسين. زمين ۽ آسمان ڏانهن شهادت لاءِ ڏسندا رهياسين.

تڏهن، جهيڻي آواز ۾ چيم، ”تون بڪ گيلريءَ جي ان ڪنڊ ۾ وڃي ويهجانءِ جتي مون تو کي پنجويهن سالن کان پوءِ ڏٺو ۽ سڃاتو هو.“

آلين اکين سان هڪٻئي ڏانهن ڏسندا رهياسين. زندگيءَ جي آزمائش مان گذرندا رهياسين. وجود جي زخمن جو عذاب محسوس ڪندا رهياسين.

تڏهن، مريم لنٽانس ريسٽورنٽ جي ٻاهرين در ڏانهن وڌي ويئي. دل سيني جي قفس ۾ گهائل ابابيل وانگر ڦٿڪڻ لڳي.

چيم، ”خداحافظ، مريم.“

هن منهن ورائي مون ڏانهن ڏٺو، ۽ پوءِ، ٻاهر هلي ويئي.

ساڍي ڇهين لڳي نعيم مون کي بڪ گيلريءَ جي ٻاهران مليو. برف ۾ ويٺو هو. ان کان اڳ جو مان ڪجهه چوانس، هن تجسس وچان چيو،”هوءَ اندر ويٺي آهي، بابا.“

ائين ئي چيم،”ڪير بابا.“

”هوءَ!“ چيائين، ”هوءَ جيڪا هوبهو امان جهڙي آهي۔ پر امان کان ڪجهه ڪجهه پوڙهي آهي.“

ماحول جي چڪ ۽اذيت کي گهٽ ڪرڻ لاءِ چيم،”اڙي يار، تنهنجي ٻه ٻاويهن سالن کان پوءِ تو کي پوڙهي نظر اچي ها. ڏيکار ڪٿي آهي“

نعيم مون کي مريم جي ويجهو اچي ويهاريو. هوءَ ڪتاب هٿ ۾ ڪٽي ويٺي هئي. نعيم مون کي تمام آهستگيءَ سان چيو، ”ڏسو بابا: امان سان ملي ٿي نہ ـ هوبهو امان جهڙي آهي نہ!“

دل گهائل پکيءَ وانگر ڦٿڪندي رهي، ۽ ڌڙڪندي رهي.

چيم،”برابر.تنهنجي ماءُجهڙي آهي.“

پوءِ ڏاڍو عجيب، ۽ حيران ڪندڙ سوال ڪيائين.پڇيائين، ”موٽي تہ نہ آئي آهي!“

سندس ٻانهن ۾ هٿ وجهندي چيم،”تہ پوءِ سڌو اسان جي گهر نہ اچي ها!“

ڪو ڪتاب ڪڻڻ جو بهانو ڪري مريم اسان ڀنهي ڏانهن ڏٺو.

نعيم پڇيو،”ڳالهايانس؟“

چيم،”همت ڪري سگهين تہ ڀل وڃي ڳالهائينس.“

مريم اسان جي ٻنهي ويجهو ويٺي هئي. هوءَ اسان جي گفتگو ٻڌي رهي هئي.

نعيم وڃي وڃي مريم جي سامهون ويٺو. اول سلام ڪيائينس، ۽ پوءِ انگريزي ۾ ڳالهائيندي چيائين،”توهين هوبهو منهنجي ماءُ جهڙيون آهيو.“

مريم منهن مٿي ڪري نعيم ڏانهن ڏٺو. سموري ممتا اکين ۾ تري آئي هئس.

نعيم ڪنبندڙ لهجي ۾ چيو ”مون کي جنم ڏيڻ کان پوءِ هوءَ هڪدم مري ويئي هئي.“

مريم ڏانهس ڏسندي رهي.

نعيم چيو، ''ڪجھ دير اڳ مون جڏھن اوھان کي ڪينٽ شاپنگ سينٽر ۾ ڏٺو ھو، تڏھن مون ھڪدم اوھان کي سڃاڻي ورتو ھو.''

''سڃاڻي روتو ھو!'' مريم انگريزيءَ ۾ ڪانئس پڇيو.

نعيم چيو، ''منھنجو مطلب آھي تہ مون ھڪدم سڃاڻي ورتو ھو تہ اوھين ھوبھو منھنجي ماءُ جھڙيون آھيو.''

غمناڪ مرڪ مريم جي چپن تي تري آئي. چيائين، ''تہ پوءِ سمجھ ڪٿي تہ مان تنھنجي ماءُ آھيان.''

نعيم ٿورو ڪلندي چيو،''سمجھڻ سان تہ ڪجھ نہ ٿيندو آھي. بس، اوھين ھوبھو منھنجي ماءُ جھڙيون آھيو.''

''ھو بھو!'' مريم ائين ڪانئس پڇيو.

جواب ڏيڻ بدران نعيم مون ڏانھن اشارو ڪندي چيو،''منھنجي بابا ڪان پڇي ڏسو.''

تڏھن مريم مون ڏانھن ڏٺو. مان وڪ ڪٿي سندس سامھون وڃي بيٺس. چيم، ''متان سمجھو تہ منھنجو دلبر پٽ ڪنھن وھم ۾ مبتلا آھي. اصل ۾ دو ڪو مان بہ ڪائي ويو ھوس.''

نعيم مون کي پيار وچان ٻانھن کان جھليندي چيو، ''اسين ٻئي ھڪئي عورت سان محبت ڪندا آھيون۔ بي انتھا محبت ڪندا آھيون، پر ان سلسلي ۾ اسان جو پاڻ ۾ جھيڙو نہ ٿيو آھي. اُن عورت جي ھڪ تصوير منھنجي بيڊ روم ۾، ۽ ٻي تصوير بابا جي بيڊروم ۾ لڳل آھي. اھا عورت منھنجي ماءُ آھي.''

مون محسوس ڪيو تہ مريم وڌيڪ برداشت ڪري نہ سگھندي. ھن

ڪنبندڙ آواز ۾ چيو، ”ڪيڏي نہ خوش نصيب آهي اُها عورت جنهن کي ايڏو پيار مليو آهي. هوءَ خوش نصيب آهي، ورنہ ايڏو پيار ڪنهن کي نصيب ٿيو آهي!“

ضبط ڪرڻ جي باوجود سندس اکين ۾ لڙڪ لڙي آيا.

”اڙي!“ نعيم تعجب وچان چيو، ”اوهين روئو پيون!“

”نہ نہ.“ مريم چيو، ”مان تہ خوش ٿي آهيان تنهنجي ڳالهہ ٻڌي.خبر تہ اٿئي تہ ڪنهن ڪنهن وقت خوشيءَ وچان انسان جي اکين مان لڙڪ لڙي پوندا آهن!“

نعيم ڪجهہ ڪجهہ پريشان ٿي پيو.

مون نعيم کي چيو، ”اسان کي موڪلائڻ گهرجي پٽ.“ هو تعجب ۽ تجسس وچان مريم ڏانهن ڏسندو رهيو. هو عقل ۽ مشاهدي جي چڪتاڻ ۾ ڇڪبو رهيو. پوءِ ڏاڍي عجيب لهجي ۾ چيائين. ”اوهين هوبهو منهنجي ماءُ جهڙيون آهيو.“

مون سندس ڪلهي تي هٿ رکيو.

هن منهن ورائي مون ڏانهن ڏٺو.

”ٺيڪ آهي.“ نعيم حسرت وچان مريم ڏانهن ڏسندي چيو، ”خدا حافظ منهنجي ماءُ.“

نعيم جو منهن ٻنهي هٿن ۾ جهلي، مريم ڪيس پيشانيءَ ۽ مٿي تي پيار ڪيو. پوءِ سندس قميص جا بٽڻ بند ڪري، سندس جيڪٽ جي زپ چاڙهي ڇڏيائين. مون ڏانهن ڏسندي، پريل پريل آواز ۾ چيائين، ”هن جي ماءُ جيئري نہ آهي. هن جو خيال رکندا ڪريو.“

چيم، ''نعيم منهنجي زندگي آهي.''

''مون کي خبر آهي ''مريم جو آواز ٻڌڻ لڳو چيائين ''مون کي خبر آهي''

''مون نعيم ڏانهن ڏٺو. هو، ائين لڳو جڻ ڪشمڪش مان گذري رهيو هو. ٻانهن ورائي مون کيس پاڻ ڏانهن ڇڪي ورتو''.

مريم آلين اکين سان اسان ٻنهي ڏانهن ڏٺو. پوءِ وک کڻي نعيم جي سامهون اچي بيٺي. نعيم کي چيائين، ''تنهنجي ماءُ جيئري نہ آهي نہ، تنهنڪري ماءُ طرفان بہ پنهنجي پيءُ جو تون خيال رکندو ڪر.''

نعيم گفتگوءَ جي تہ تائين پهچي نہ سگهيو. سڀ ڪجهہ کيس اوپرو اوپرو محسوس ٿي رهيو هو. مون لاءِ بي انتها پيار وچان چيائين، ''منهنجو پيءُ پوڙهو ٿورو ئي آهي. مون کان وڌيڪ طاقتور آهي.''

جيئن ماس ننهن کان ڏارڻي وڃي، تيئن مون مريم ڏانهن ڏسندي چيو، ''اسان ٻنهي جي حق ۾ دعا ڪجو. ٿي سگهيو تہ اسان کي ياد رکجو. خدا حافظ.''

''ترسو، گهڙي کن لاءِ ترسو.'' التجا واري نوع ۾ اسان کي بيهاري ڇڏيائين. شيلف تان ميڪسم گورڪيءَ جو ناول، ماءُ، کڻي آئي پرس مان پين ڪڍي ناول جي اندرئين صفحي تي لکيائين، ''پياري پٽ نعيم لاءِ هڪ ماءُ طرفان، جيڪا هوبهو سندس ماءُ جهڙي آهي.''

ناول نعيم کي ڏيئي، هن هڪدم منهن ورائي اکيون اگهي ورتيون. پوءِ، تمام جيٽي آواز ۾ چيائين، ''خدا حافظ''

اسين اسلام آباد موٽي آياسين. نعيم مون کي منجهيل منجهيل محسوس ٿيو. کيس اٽڪ ورائي ويئي هئي. هو رات جو دير تائين جاڳندو رهيو، ۽

لاڳيتو مريم جي تصوير ڏانهن ڏسندو رهيو.

ٻئي ڏينهن صبح جو مار گلہ روڊ تي ڊوڙندي نعيم مون کان پڇيو، ”هوءَ کير هئي بابا، ۽ هوبهو امان جهڙي ڇو هئي؟“

ڊوڙندي ڊوڙندي مان بيهي رهيس. محسوس ڪيم، مان وڌيڪ ڊوڙي نہ سگهندس. سهڪڻ لڳس. نعيم بہ بيهي رهيو.

پڇيائين، ”ڇو بابا؟“

چيم، ”مان ٿڪجي پيو آهيان پٽ.“

روڊ جي پاسي کان مان ڇپر تي ويهي رهيس.

منهنجي پرسان ويهندي چيائين، ”مان بہ ٿڪجي پيو آهيان، بابا.“

”يار، بندل نہ هڻ.“ چيم، ڪيس خوش ڪرڻ لاءِ، ”تون جوان آهين. تو کي اجان ڊوڙڻو آهي ـ سيني کان اڳ نڪرڻو آهي.“

پيار وچان چيائين، ”پر، اوهان کان سواءِ نہ بابا.“

دل اُداس ٿي پيئي. چيم، ”هڪ هارٽ اٽيڪ کان پوءِ، هينئر مان ڪنهن بہ وقت اوچتو هليو ويندس. تو کي اڪيلو ڊوڙڻو پوندو پٽ.“

”ناٽ پاسيبل بابا.“ آسمان ڏانهن ڏسيندي، ڏک ۽ پاٻوهہ واري نوع ۾ چيائين، ”منهنجي مرضيءَ کان سواءِ ڪجهہ بہ نہ ٿيندو. اسين هلنداسين، تہ گڏجي هلنداسين.“

۽ ٿوري دير کان پوءِ اسين وري مارگلہ روڊ تي ڊوڙڻ لڳاسين.